

بس اک سخن ہر جانی..... اُس مریم

گلاس ڈور کھل کر اندر آنے والا اپنی دھن میں آگے بڑھتے ہوئے ٹھٹک سا گیا۔ وہ نہایت روشن آنکھیں نا کواری سے اس پر چمکی تھیں اور وہ زور سے ہونے والوں میں سے نہ تھا البتہ صورت حل کی تھی کہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لگژری آفس کی لمبی میز کے پیچھے ریوا لونگ چیئر پہ بچھلے چار ماہ سے وہ جس صورت سے آشنا تھا وہ اس قدر بڑیکشن اپنے اندر رکھتی تھی کہ سلطان شاہ جیسا بندہ یوں بغور دیکھنے پہ مجبور ہو جاتا اور نہ ہی اس سے قتل وہاں اتنی دیر دینے وقت اجازت کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ دستک کی۔ ریوا لونگ چیئر پر براجمان فونو وجود اگرچہ مکمل حسن اپنے اندر سینے تھا مگر سلطان شاہ کے قدم ٹھٹھکانے کا باعث وہ لکونی نقوش سے بھرا چہرہ نہیں بلکہ ان آنکھوں کی نا کواری اور قتل تھی جو کہ سلطان شاہ کو دیکھ کر رہائی تھی۔ سچی اس موی جسے میں تحریک پیدا ہوئی۔

”تم اندر آؤ۔“ انٹرکام کارمیں سوراٹھا کہ یقیناً سکرٹری کو طلب کیا گیا تھا۔ اس اثنا میں سلطان شاہ سنبھل چکا تھا اور نہایت اطمینان و اعتماد سے چلتا ہوا نیبل کے قریب رکھی چیئر پر بیٹھنے کے بعد اس کا جائزہ لینے لگا۔ کو کدو بہت خوب صورت تھی مگر مقابل بھی سلطان شاہ تھا جسے نڈھ لڑکیوں کی کئی تھی اور نہ حسن کی۔ اس سے کہیں زیادہ حسین ترین لڑکیاں اس کی ایک جنس برہنہ قدموں میں ڈھیر ہونے کو فخر سمجھتیں مگر سلطان شاہ بے حد مغرور اور بے نیاز تھا نہ ہی یہ اس کی کمزوری تھی۔

”دور ملک نظر نہیں آ رہے ہو آپ کون ہیں؟“ سلطان شاہ نے اس پر سرسری نگاہ ڈال کر پوچھا۔ لہجے کی حاکمیت اور چہرے کے نقوش سے چھٹکتی عزت نے ایمن کو سچ پا کر دیا۔ زہریلی نگاہ اس پر ڈال کر جواب دیئے ہاں اندر آئی سکرٹری کی سمت متوجہ ہوئی۔

”اگر ان کی پائمنٹ تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اگر میں بھول چکی ہوں۔ تب بھی تم نے انہیں میری اجازت کے بغیر اندر کیسے بھیج دیا؟“ ایمن کی آنکھیں نے سُٹپائی ہوئی سکرٹری کو مزید بولنے کے رکھ دیا۔ جیسی سناتے ہوئے بولی تھی۔

”میڈم یہ سلطان شاہ ہیں۔ باس کے برنس پارٹنر جب جی چاہتا ہے آ جا جاتے ہیں سر سے ملنے۔“ سکرٹری کی وضاحت پہ بھی اس کا مگر موز ٹھیک نہ ہوا۔ چہرے کے زلوئے بگاڑتے ہوئے بری طرح جھڑک دیا۔

”بک بک نہ کرو تمہیں پتہ چھاپا آفس میں نہیں پھر نہیں باہر روک کر مجھے انعام کیوں نہیں کیا؟“ سلطان شاہ جو اس بحث سے اُتار رہا تھا۔ بری طرح سے چونک کر ایمن کو دیکھنے لگا جو نڈھ لڑکی پہ برس رہی تھی۔

”جب میں تمہیں ڈسٹرب کرنے سے منع کر چکی تھی پھر۔“

”سوری میڈم! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ سکرٹری گڑگڑائی۔

”غٹ اپ! آئندہ تمہیں موقع کون دے گا۔“

”آئی ایم سوری میڈم پلیز۔“ سکرٹری گھکھکی گئی۔

”ٹاؤگٹ آؤٹ۔“ ایمن کے دھڑکانے پہ سکرٹری سر جھکا کر چلی گئی کہ ایمن کے پکارنے پر غم گئی۔

”اور ہاں انہیں بھی میری طرف سے یہی حکم ہے جو تمہارے لیے ہے۔“ سلطان شاہ کی سمت اُٹھ کر جس قدر بات آمیز انداز میں کہا گیا تھا وہ سلطان شاہ جیسے بندے کو ”تھے سے اکھاڑنے کو کافی تھا۔ احساس تو ہیں سے سلطان شاہ کا وہ چہرہ آن واحد میں انکار کے کی طرح ذہک اٹھا۔ قہر برساتی نگاہ ایمن پر ڈال کر وہ جھٹکے سے کرسی دھکیلی کر کھڑ ہوا تھا۔ کہنی کی پھڑکتی رگ اور فرخ پیدائشی کی لاتعداد ٹینکیں اس کے موڈ کی واضح غارتگی تھیں۔ اس سے قبل کہ نظری غصے کے زیر اثر کوئی انتہائی اقدام کرنا یا یک ہی ایک خیال اسے اپنے اراوے سے باز رکھ گیا تھا۔

ایمن ملک کی پرسکون جھیل کی مانند زندگی میں پہلا پتھر تب طلسم پیدا کر گیا جب دھیمی دھیمی سرکوشیاں چوگولیاں اڑتے اڑتے اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔

”سنا ہے بیٹھ داور کا دیوالیہ کھل گیا ہے۔ سینٹ صاحب تو بالکل نکال ہو جائیں گے۔ ارے وہ تو بکے جواری بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص اس لست میں بڑ جائے اس کا دیوالیہ تو نکلے گا۔“ ایمن ملک چونک گئی تھی جب اس بات کی تصدیق کے لیے سینٹ دور کے پاس پہنچی تو انہیں اپنے ہی گھر کے بیڑم میں نشے میں دیکھ کر سناٹے میں رہ گئی۔

”پاپا یہ کیا کر رہے ہیں؟“ رن غم سے سگڑا بندھ گیا تھا۔ ماما سے ٹھیک کر باہر نہ آتیں تو شاید نشے میں دھت باپ سے اچھ پڑتی۔

”مالا پاپا کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اس قدر دل گئے ہیں کہ انہیں بالکل خیال نہیں رہا۔“ ایمن کا غم گھم کے باعث بندھ گیا یہ تکلیف دہ دور تھا اس کی برداشت سے باہر تھی۔

”میں کیا کہوں ایمن! میں خود پریشان ہوں۔ لیکن پلیز تم اس بات کو ذہن پہ سو امرت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں تم سے کام لینا چاہیے۔“

”تم سے کام لے کر کیا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نو ماخود غم دیکھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔ آپ مجھے سب کچھ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟“ ایمن کا ضبط جواب دے گیا تب ماما اس کی ضد کے سامنے ہنسنا ہوا پڑا۔ ان کے منہ سے سب کچھ تفصیل سے جان کر وہ شاکر ہو گئی تھی۔

”ملا ب میں خود آفس دیکھوں گی حالات اس نچ پتلیج کچے ہیں اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ آخر کار یہ فیصلہ کر کے وہ جیسے قوی طور پر مطمئن ہوئی تھی۔



”تم نے تو کہا تھا ساتھ جیس مر رہی گئی۔ کیا ہوئے وہ دھڑکنے والے قسمیں اب چھوڑ رہے ہو مجھے اس مول پہ آ کے جب رسولی میری ذات کی دلیز پہ قدم بھر چکی ہے۔ نہیں آصف میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گی۔ تم مجھے اتنی آسانی سے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

لااں کے قدم زمین نے جکڑ لیے دروازہ کھولنے کو تھا ہاتھ وہیں ساکت ہو گیا۔

”تم میری محبت اور وفا کو یوں محاکر کر نہیں جاسکتے۔ تمہیں پتہ ہے م میں تمہارے۔“ آگے جو کچھ بھی کہہ رہی تھی لااں کا کمزور دل سہہ نہ پایا۔ کچھ دھک سے رہ گیا۔ بے جان ہو تے وجود کو مشکل ٹھیک کر انہوں نے دھڑکنے سے دروازہ کھلیا تھا۔ اس دھماکے پہ درجنف بالوں کو لول سے جھک کر مڑی تھی۔ لااں پہ نگاہ پڑی تو منہ بگاڑ لیا۔

”کیا ہے لااں؟ کبھی تو اُٹھنگ سے آجلیا کرو۔“ لااں جو بلدی کی مانند زور دہری تھیں اسے تہا ہا کر جہاں مطمئن سی ہوئی تھیں وہیں اس کے یوں ہولا دینے پہ یک دم ہی غصے کی زیادتی سے لرزے لگیں۔

”کینی نامر اوتو نے مجھے ڈرا ڈالا۔ اری میں کبھی کون اونٹا پاپا ڈا گھر میں گھس آیا جس سے تو راز و نیاز کر رہی ہے۔“

درجنف کے تعلق میں کڑواہٹ گئی آنکھیں غصے کی زیادتی سے سلگنے لگیں۔ لااں اس کے غصے سے بے نیاز سی موڈ میں بولے جاری تھیں۔

”میری اداکاری کا یہ شوق مجھے لے ڈوبا جائے کیوں دیوانی ہوئی جاتی ہے۔“

”لااں بس بھی کریں سارے خراب کر دیا کتنی اچھی ہوگی یہ میری ڈائلاگ ڈیلوری اور جائے دلوہے کے تارڑنے لگیں۔“ اس کی بات پہ لااں کا پارہز بد چڑھ گیا۔

”ظہر بد ذات تجھے میں بتاتی ہوں۔“ انہیں جھک کر چپل اتار تے دیکھ کر وہ کچ بولگائی۔

”ظہر و لااں بات تو سن لو۔“ ان کا وار جاتی ہوئے وہ چلا تے ہیں بولی لااں کا کھنچ کر مارا ہوا جوتا اس کے داہنے شانے کی خبر لے گیا۔



سلطان شاہ ہال اینڈ ٹنڈر تھا۔ غضب کی ڈریمنگ نے سسر پر کشش بنا دیا تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا پورا پورا احساس تھا۔ جیسی تو جال میں غور و نہاں تھا۔ یوں اکثر کر چلتا جیسے کسی ریاست کا شہزادہ وہ چہرے کے خدوخال سے عزت و عظمت کی جھلکتی تھی۔ لہجہ تھمنا نہ ہوتا آنکھوں سے عیب کی سر جھری کو ترخ کی شعاعیں نکل کر مقابل کو اس سے خائف اور سہمے رہنے پر اکساتی تھیں۔ اس کی ایک ایک جنس سے بے نیازی لا پڑی کہ تاثر چھلکتا تھا۔ مالدار تھا۔ کسی شے کی کمی نہ تھی پھر برائیاں کیسے اس کی ذات سے وابستہ نہ ہوتیں۔ اس کی چارمگ شخصیت میں جانے کیسا حیرت انگیز لڑکیاں اس کی ہر جانی فطرت کو پار بھی دیوان و نثار ہوا کرتیں یہ سب تھا اس کے باوجود ایمن ملک وہاں ٹوٹی تھی جس نے اس کے بے نیاز احساسات کو گویا بے دردی سے جھجھوڑا تھا۔ تب سے وہ ایک بل کے لیے بھی ایمن ملک کو ذہن سے نکال نہ پا تھا۔ وہ صرف وہ انصاف تھی جو دانستہ یا نا دانستہ ایمن ملک اس کی کر چکی تھی۔ اور سلطان شاہ معاف کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ایمن ملک اس کی لست پر پہلے نمبر پہ آچکی تھی۔ سیاہ آہنی آلوہنگ گیت واہوا تھا اور واٹ لینڈ کرہز پرور ٹیکو میں آن رکی۔ واٹ کاٹن کے کھڑکھڑاتے شلوار سوٹ میں سلطان شاہ آمد ہوا تھا۔ خادم حسین پور ٹیکو سے لان کے رستے اندر جاتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے آتے خادم حسین کو پکارا۔

”جی سرکار! حاضر۔“

”جو کام تمہیں سونپا تھا کہاں تک پہنچا؟“ نشان سے گردن اڑاتے زمین روندنا ہو لوہر کے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔

”سرکار آپ کے حکم کے مطابق جلد نکال ہو جائے گا۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے بلکہ دو تین ہاتھ لڑ چھ بھی گئے ہیں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ انتظار کریں سرکار۔“ اس کے قدموں کا ساتھ دینے کی کوشش میں خادم حسین باقاعدہ دوڑ رہا تھا۔

”اوکے گڈ مروت۔“ اس نے نطوت سے سر ہلایا اور ہاتھ سے اسے اپنا کام کرنے کی اجازت دی یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب اسے خادم حسین کی ضرورت نہیں اور خود اسی رفتار سے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا جبکہ خادم حسین رک کر سانس بھال کرنے لگا تھا۔



”کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟“

”کب آئے گا؟ آکے میرا نجان جائے گا“

اس شہزادے کی میں روتھوں۔“

ڈیک فل وایوم میں چل رہا تھا درجنف رائل بیلیو ساڑھی پہنے بال کھراے لہر لہر کر چکی تھیں خود بھی ساتھ ساتھ گنگنار رہی تھی۔ لااں نے ہنسی دیتے ہوئے برآمدے کی کھڑکی سے اسے آتشی دھ ہوں سے گھور اگردہ پوری طرح گنگن تھی جھری ڈوگری میں بیخ کر لاں منتقل ہوئی اندر آئیں اور بڑھ کر ڈیک کا سوٹ کھنچ دیا۔ میوزک جیسے ہی کوپا اس کا جسم بھی ساکت ہو گیا۔ لااں پہ نگاہ پڑتے ہی پہیلے جھپٹی جھپٹی بگاڑتے ہوئے بولی تھی۔

”اما! کیوں ٹیپ بند کیا اتنا مزہ آرہا تھا۔“

”ارمی کو کم بخت چھوڑ کر شرم نہیں آتی دیدوں کی حیا مرگئی ہے تیری کہاں کے سامنے جاتی ہے۔“ اماں نے اپنے تئیں اسے غیر تسلیم دلا دیا چایا مگر وہ تو تھیں سے اکھڑ گئی۔

”تو کیا وہ اماں! میں تو تمہارے سامنے جاتی ہوں اور تمہاری لادلی بیوتی ہے وہ تو ہزاروں کے ٹھکے کے سامنے بے حیائی سے اپنا آپ دکھاتی ہے۔“ اس سے پہلے کہ درجنف کی زبان مزید ہڑ گئی اماں کے ہاتھ نے حرکت میں آکر زنا لے کا تھپڑ اس کے دہانے گال پر دے مارا تھا۔

”مجبوری اور شوق میں فرق ہوتا ہے۔ اتنی سی تھی جب تیرا پل مرا اکون کھانا اگر وہ گھر سے نہ نکلی اور آج تو اس کی دشمن ہو رہی ہے۔“ اماں غرا رہی تھیں۔ درجنف اس حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ اپنی جگہ وہ مل کر رہ گئی تھی۔ حیرت رن غیر یقینی سے ڈنڈائی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”تیرے دیدوں کا پانی ختم ہو گیا گھڑی کیسے منہ چھڑا کے بڑی بہن کی بات کرتی ہے۔ ہانڈی جو لمبے سے تھے رغبت نہیں لڑکیوں بالیوں والا کوئی شوق نہیں لے کے کھٹا کھانا دیا گھر کو ٹھیک ہے تو نہیں سدھرنے کی۔ کرتی ہوں تیرا انتقام۔“ اماں غصے سے لال پٹی ہوتی بکتی جھکتی محن میں جا کر ہزہڑی بنائے لگیں جبکہ درجنف غصے سے کھولے ہوئے مسلسل ہڑہڑا رہی تھی۔

”ہاں میں ہی فالتو ہوں جو گھر سنبھالوں چوہوں کو تباہ لے کے تھپڑ مار دیا۔ سن اماں مجھے یہاں نہیں مڑنا۔ میں ضروری فلموں میں کام کروں گی ہاں آخر اتنا سن گھر میں ہانڈی چوہا کر کے کھانا تھوڑی ہے۔“

بہوہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے سلکونی نقوش سے بچے مچھیرے کو دیکھ رہی تھی جبکہ لاں یوں کال ہند کیے ٹپٹی تھیں جیسے کچھ سائی نہ دے رہا ہو۔



داہر ملک کی چلی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے سلطان شاہ نے کہا۔

”میں چلتا ہوں۔“ داہر ملک گھر آکر کھڑے ہو گئے۔

”ارے اتنی جلدی۔“ سلطان شاہ نے معنوی حیرت کا اظہار کیا پھر خادم حسین کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔ خادم حسین بنگلی کی تیزی سے حرکت میں آیا اور لگے ہی لمحے بہترین مشروب گلاس میں نازل کر دیا اور ملک کے ہاتھ میں گلاس زبردستی تھا دیا۔

”بیٹھے جناب۔“ زبردستی ان کے کندھوں پہ دباؤ ڈال کر صوفے پہ کھینچے ہوئے خادم حسین نے مالک کے حکم کی تعمیل میں لوجھری کا خیر نہیں کی۔

”داہر ملک ایسا آخری داؤ ہے لگا دیں ہو سکتا ہے اس بار آپ جیت جائیں۔ یہ ایسا اکیل ہے کہ کچھ کھا تو نہیں جاسکتا۔“ سلطان شاہ صوفے کی ایک سے ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بہت لاپرواہ انداز میں اس کے سامنے تھا۔

”مگر میرے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا۔“ داہر ملک نے برا سا گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ چہرہ پسینے میں ڈوب رہا تھا اور آنکھیں نشے کے باعث بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں۔

”اوہ بیٹھ صاحب! اب ہم سے کیا پروہا بھی تو بہت کچھ باقی ہے۔ شروع کریں پھر۔“ سلطان شاہ اس جنگل کا گھاگ ڈکارا تھا جبکہ بیٹھ داہر نیا ”بیٹھی تھا اب آسانی اس کے جال میں پھنس گیا، مگر اب واقعی وہ خالی ہاتھ تھا۔

”نہیں یقین مانو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ داہر ملک بے تحاشہ پینے کے باعث جھومتے ہوئے بولے۔

”میری معلومات کے مطابق ابھی آپ کی سرسٹریز پور زاتی رہائش کا بندھ داتی ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ بیٹھ داہر نے زور و شدت سے سر ہلایا۔ ”یہ میری آخری اپنی ہے۔ میں اب نہیں کھیلوں گا۔“ داہر ملک نے نشے کے باوجود اس محل رکھے تھے۔ سلطان شاہ نے گھور کر انہیں دیکھا تھا مگر کچھ نہ کٹرول کئے رکھا۔

”ہو سکتا ہے اب کی بار آپ جیت جائیں۔ میدان چھوڑ کر کیوں بھاگ دے ہیں۔ یہ تو سرسٹریز دلی ہے۔“ اس نے داہر ملک کی سوتی ہوئی غیرت پہ تازیانہ مارا۔ ”کیا لگائیں گے آپ؟“ سلطان شاہ بیٹھ داہر اس کی توقع کے عین مطابق اس جذباتی بلک مینگ میں دھڑلے لگے۔ سلطان شاہ کے ہونٹوں کی تراش میں فافا تھانہ مسکراہٹ ریک گئی۔

”جلیں اگر میں ہارواؤں ایک کروڑ روپیہ آپ کو دوں گا آپ ہار کر بزنس سے دستبردار ہو چکے ہیں“ آپ کے جیتنے کی صورت میں پور بزنس آپ کا ہو جائے گا۔“ اس نے مہم سا مسکرا کر عیاری سے کہا۔

”اوکے لوکے گاؤ پھر۔“ بیٹھ داہر کی یہ سنتے ہی باجھیں کھل گئیں۔ سلطان شاہ نے خادم حسین کو اشارہ کیا تھا۔ خادم حسین نے کا تو اس سے کوئی نکال کر پورا اور میں ڈالی تھی پھر جیبر گھبرا کر پورا اور سلطان شاہ کو پیش کر دیا۔ ”لیجیے سر۔“

سلطان شاہ نے پورا اور داہر ملک کی سمت بڑھایا تو وہ ہری طرح جھوک گئے۔

”یہ یہ کیا کر رہے ہو؟ پیچھے کرو چل جائے گا۔ کوئی ہے اس میں۔“ داہر ملک کو یوں اچھل کر پیچھے ہٹے دیکھ کر سلطان شاہ بے ساختہ متوجہ لگانے لگا۔

”کم آن بیٹھ صاحب ابی بر پور مدینیں یہ سانپ پچھو نہیں ہے۔“ انہیں زبردستی دیکھ کر وہ ہنسی روک کر بولا۔

”نہیں ہٹاؤ لے۔ اس کا بھلا کیا بھروسہ۔“ انہوں نے تیزی سے دوسرے ہی پیچھے پیچھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تب سلطان شاہ ہنسی ترک کر کے شہید ہو گیا۔

”اب کی بار ہار جیت کا فیصلہ یہ پورا اور کے گے بیٹھ صاحب باجیت ورنہ موت۔“ اس نے پورا اور ان کی کوس میں جھینکتے ہوئے سفاکی سے کہا۔ بیٹھ داہر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ”تو فوہ نہیں ہوگا۔“

”اوکے ڈنٹ وری۔“ سلطان شاہ نے انہیں سر دہڑتے دیکھ کر مفاہمت کی راہ اختیار کی۔

”پھر یہ کھیل میں کھیلتے ہوں۔ موت کی صورت میں ہر اسب کچھ آپ کا“ آپ کی ہار میں آپ کا بنگلہ اور گاڑی میری اور چونکہ آپ کھیلنے پہ آمادگی ظاہر کر چکے ہیں زبان سے کرنا بھی موت ہے۔“ اس نے روکھائی سے کہتے ہوئے جھپٹ کر پورا اور اپنے قبضے میں کر لیا۔ داہر ملک کی آنکھوں سے واضح بے بسی جھلکتی گئی۔

”اوکے شروع کرتے ہیں۔“ داہر ملک نے طوعاً کرہاً سر ہلایا البتہ ان کی آنکھوں سے خوف جھاک رہا تھا۔ چہرے پہ پریشانی مترشح تھی جبکہ سلطان شاہ کے ہونٹوں پہ واضح مسکراہٹ تھی جیسے یقین، فوج اس کا ہائی فیب بٹنے والی ہو۔ اس کے برعکس خادم حسین سلطان شاہ کے اس اقدام پر ہری طرح گھبرا گیا۔ چہرہ فنی ہوا تھا جب بھی سلطان شاہ اس طرح کے انتہائی اور کھاناؤں و جان لیوا کھیل کھیلتے۔ خادم حسین یوں ہی بے قرار رہے کل سا ہو جاتا۔ اس وقت بھی مارے فضا پر اب کے چپ منہ رہا۔

”رحم سرکار۔“ وہ گڑ گڑا اگر چہ دہ جانتا تھا کہ مالک کو خادم حسین کا یہ اعتراض بیہوش کی طرح گراں گزرے گا اور وہ اب بھی سب ساقی ہری طرح ڈانٹ دے گا مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا۔ جو اپنے سرکار سے بے حد محبت کرتا تھا۔ بے غرض محبت۔ خادم حسین تو اس کے ایک اشارے پہ جان وادار کھاتا۔ پھر اسے موت سے کھیلتے کیسے دیکھ لیتا۔ سلطان شاہ جو پورا اور کھینچی پھر دیکھ چکا تھا خادم حسین کی کج بخت بھری اعداقت پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ خادم حسین نے گڑ گڑائے کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے حکم کریں سرکار میں کراؤں۔“ خادم حسین بے بسی سے گھٹکھیا کر بولا جواب میں سلطان شاہ ایک سر دھکا اس پہ ڈال کر بے نیاز بن گیا مگر اس ایک دھکا نے ہی خادم حسین کو اندر تک سن کر دیا تھا۔

”ون۔“ سلطان شاہ کی اطمینان بھری آواز سن کر داہر ملک نے شدت سے فائر ہونے کی دھما لگی۔ ”نو۔“ خادم حسین نے دونوں ہاتھ جما کر کانوں پہ رکھے اور آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ اب وہ گڑ گڑا کر رب سے سلطان شاہ کی خیریت کا مطلوب ہو گیا۔ داہر ملک پسینے میں ڈوبنے لگے۔ فضا پر اری انداز میں ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ ”تھری۔“ اس کے ساتھ ہی سلطان شاہ نے زنگیو دیا اور دو اور ملک جو ایک کانوں کو چھڑا دینے والا دھماکہ سننے کے منتظر تھے صدے کی زیادتی سے جیسے جھڑ گئے۔ سلطان شاہ فافا تھانہ مسکراہٹ یوں پہچانے کی گھبراہٹ سے بھر پور محظوظ ہو رہا تھا ایک گھر اور طویل سانس خادم حسین کے پیچھے دھو سے آڑو ہوا۔ خوشی کے باعث اس کا چہرہ جھلکتے لگا۔

”فتح کی مبارک باد نہیں دیں گے بیٹھ صاحب۔“ سلطان شاہ کی دل ہلانے والی مسکراہٹ نے داہر ملک کی آنکھوں تلے اندھیرے ڈال دیے۔ پکراتے سر کو کھاتے ہوئے انہوں نے خود کو سنبھالنا چاہتا تھا۔ کیسے سامنا کر رہی گامیں اپنی فطری کا اور دنیاوت لے تو مجھے..... اف کیا غلطی ہوگئی۔ داہر ملک کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ جب سب کچھ تباہ ہو گیا۔ سلطان شاہ ظہر یہ بے ساختہ ہٹا چلا گیا۔ اس کے برعکس داہر ملک جیسے موت کا پروانہ ہاتھ میں لیے قریب امرگ تھے۔ سلطان شاہ کی فطری تھی۔ اسے رتی برابر بھی داہر ملک کی پریشانی کا احساس نہ تھا جو شدید فضا پر کا فکار مسلسل پہلو بہد لے ہوئے اب گھرا اس کے اگلے اقدام کے منتظر تھے۔ سلطان شاہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پہ ان کی آئندہ زندگی کا دار و مدار تھا۔ خادم حسین ہر شے سے بے نیاز بہت ملٹھی اور بیار بھری نظروں سے سلطان شاہ کو نکتے جا رہا تھا۔ جبکہ سلطان شاہ نے ایک بار بھی اس پہ نظر ڈالنا کو اور نہ کی تھی۔ داہر ملک کی جانب رونے لگا تھا۔ جن کا ضبط اب کس چھلکا ہی چاہتا تھا۔

”اس کر اسسں بچویشن سے اگر آپ چاہیں تو نکل بھی سکتے ہیں۔ اتنی میں دوسرا رستہ بھی ہے۔ یعنی آپ کا بنگلہ اور گاڑی آپ کے پاس رہ سکتی ہے۔“ سلطان شاہ نے بہت اطمینان سے اپنے مقصد کی جانب آتے ہوئے داہر ملک کو چوکنے پہ مجبور کر دیا۔ داہر ملک جو نکست خوردہ فوریہ حال سے گردن نیوڈائے ہوئے تھے جھٹکے سے سیدھے ہو گئے۔

”دوسرا رستہ کیا ہے؟ جلدی بتاؤ۔“ ان کی توجہ فوری ہو جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ دل یکبارگی شدتوں سے دھڑک اٹھا کیا ایسا ممکن ہے کاش اس بار میں فافا جوں آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ انہوں نے دل ہی دل میں عہد بندہ اور امید بھری نظروں سے سلطان شاہ کو نکتے لگے۔ داہر ملک کا فضا پر انتہا کو بچھا تو وہ بھاری لہجے میں ان سے مخاطب ہو رہا تھا۔

”داہر ملک! آپ کی ایک بیٹی بھی تو ہے۔ کیا نام ہے؟“ اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے پیشانی مسل کر گویا ذکر نے کی کوشش کی۔

”ایما۔ ایمن۔“ داہر ملک نے جلدی سے یہ مشکل آسان کرتے ہوئے کسی قدر انجینے سے لے دیکھا۔ ”مگر اس کا بہن کیا ذکر؟“ اب انہیں غصہ نہ لگایہ کم بخت جان بوجھ کر میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ وہ جھلا کر سوچنے لگے تھے۔

”اوہ ہاں شاید ایمن۔“ سلطان شاہ نے سر اثبات میں ہلایا۔

”دور ملک آپ کی گاڑی پور بنگلہ آپ کے پاس رہ جائے گا۔ امین ملک کو مجھ سے دیں۔“ دور ملک کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے اطمینان سے مدعا بیان ہوا۔ دور ملک جھونچکے سے آنکھیں پھاڑے جیسے اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔



فل فٹنگ کی شرت کے ساتھ چوڑی پاجامہ زیب تن کیے پشت پہ بالوں کا آئینہ رگڑا کرے دوپٹہ سنبھالتی سچ چلتی چلتی وہ جیسے ہی باہر آئی ماں کے پاس خالد ٹپا کو بیٹھے راز و نیاز میں مگن دیکھ کر تمس کی رنگ پھڑک اٹھی۔ ماں خالد ٹپا سے سرکشیوں میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھا تو خالد کو بوا کا مار کر خود بھی خاموش ہو گئیں۔

”در نجف! اوہ آ۔“ ماں کے بلانے پہ وہ پلک جھپک چٹکی لگی۔ اس روز کے معرکے کے بعد سے ماں نے بول چال بند کر رکھی تھی۔ صلح کا پرچم لہرانے کی اس نے بھی ضرورت نہ سمجھی کہ اس طرح اس کے اپنے پیش تھے۔ امیر (بی بی بن) کے ملوومات بہن کے سارا دن ایک لنگ کا شوق پورا کرتی۔ کبھی کبھار واک کرتے ہوئے خوش ہوتی۔

”ہاں ماں۔“ نزاکت سے دوپٹہ سر پہنکاتے ہوئے بلیکین بھپکاتے ہوئے اس وقت وہ ہاتھ دار بیٹی کا بہرہ بھرے تھی۔

”یہ کیا گھر میں بھی اسی طرح سولہ گھار کے رکھتی ہے؟“ خالد ٹپا نے اس کے بالوں میں اگلے مویٹے کے کجروں اور فل میک اپ کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ خوشبو لٹرائی جبکہ مال خست بد مزہ ہونے کے ساتھ شرمندہ منہ دکھائی دیے گئیں۔

”نہیں آج تو اس کی سٹیلی کی سالگرہ ہے۔ وہیں جانے کو تیار ہوئی ہے۔“ جھوٹ بولتے ہوئے انہیں غاصی وقت کا سامنا کرنا پڑا مگر اولاد کی خاطر بہت سے پل صراط طے کرنے پڑتے ہیں۔ اب انہیں بچا کر اگے بھڑکتے ہوئے گولہ لٹیس۔ البتہ در نجف کو آنکھوں سے تنبیہ کرنا نہیں چھو لیں۔ گویا بچا اگلے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی جانے کس موڈ میں تھی چٹکی رتی۔

”ہاں اس طرح جی سنو ری بھی رہتی ہے تو خیر ہے۔ اب دور بدل گیا بہن! لڑکے اسی طرح کی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ پھر اس پٹو اوڑھا پہننا چتا بھی ہے۔“ خالد ٹپا کی تعریف نے در نجف کی باجھیں چیر دیں۔ جتنا ہی نگاہوں سے ماں کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ایک آپ۔ مانیں تو کیا وہ ادنیٰ تو میرے حسن کو مانتی ہے۔ ماں اس کی سکر بہت پہ کلس گئیں۔ جی اے اٹھاتے ہوئے بولی تھیں۔

”چل اٹھ جا چائے بنالا خالد کے لیے۔“ در نجف کوئی اور وقت ہوتا ہے سے انکار کر دیتی مگر ابھی ابھی خالد کے منہ سے سنی تعریف کا نشہ مار بن کر چھایا تھا۔ جی اے اسی سرخوشی کے عالم میں اٹھ گئی۔

”بہن میں اللہ کی کوئی گئی۔ تمہاری بیٹی بھی خوب صورت ہے مگر لڑکا تو بہت ہی خوب ہے۔ دیکھنے میں ٹھنڈا لگتا ہے۔ ایسا شیر جون کہہ دیکھتے ہی دل خوش ہو جائے۔“ بی بی بن مانوں اب تک ہزاروں رشتے کروائے مگر ایسا بکا چلیا لڑکا کبھی نہیں دیکھا۔ تمہاری بیٹی کا تو نصیب روشن ہو گیا۔ چنانچہ میرے ساتھ۔ یہ منہ کی بات نہیں دیکھ کر تم خود یقین کر لیتا۔“ خالد ٹپا جوش سے بتاتے ہوئے آواز کو ابیوم بھی بڑھا گئی تھیں جی در نجف کے کانوں تک با آسانی سب کچھ پہنچ گیا۔



”کیا آپ نے اپنی بیٹی جوئے میں بہا دی۔“ ملا شاک میں گھر کر انہیں دیکھنے لگیں۔

”غٹ اپ بیگم میں نے امین کو جوئے میں نہیں بہا لیا بلکہ اس کا رشتہ سلطان شاہ سے طے کیا ہے۔“ دور ملک اسی قسم کی صورت حال کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے۔ بنا گھبرائے اطمینان سے بولے۔

”ہاں آپ تو یہی ہی کہیں گے۔“ ماں نے زیر خند سے جواب دیا۔

”زیادہ بکواس نہیں کرو میں نے تمہیں جھگڑا کرنے کو نہیں بلایا۔ جا کر امین کو بتا دو۔“ دور ملک نے رکھائی سے جواب دیتے ہوئے واردۂ رعب سے اپنے کپڑے نکالے اور پلٹ کر دیکھے بیواش دم میں گھس کر دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔

مادہاں سر ختام کے بیٹھے گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ امین مر جائے گی مگر کبھی راضی نہیں ہوگی۔ کور سے راضی ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ایک جواہری کے ہاتھوں کھلونا بننے سے بہتر ہے وہ ایک ہی بار موت کو ٹھک لگالے ایسے شخص کا کیا بھرہ کل کو وہ بھی جوئے میں لے ہار دے۔ اگر باپ نے خیال نہیں کیا تو ایک غیر آدمی کو کیا پروا ہے اپنے خیال نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔

”ملا! میں شانزے کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ یونیورسٹی بھی جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ رہ جائے۔ آپ پریشان مت ہوئے گا۔“ جاتے جاتے امین نے انہیں آگاہ کیا تھا مگر ان کے اندر اناشتہ نے چڑھنا دیا۔

”ملا! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ قدم بڑھا کر قریب آتے ہوئے اس نے پریشانی میں گھر لو کچھ کر استفسار کیا تھا۔ ان کا چہرہ دھوپر ٹھٹھٹے ہی رہی طرح چوک گئی۔

”ملا! اپنی پرالم! کیا ہوا ہے؟“ ان کی زورور گت نے معاملے کی سنگینی کا راز فاش کر دیا۔

”ایسا امیری بیٹی تمہارے پیانے۔“ بولٹ کرنے کی آواز پر وہ گجرا کر بات پوری کیے بتائی خوفزدہ نظروں سے واث دم سے برآمد ہوتے دور ملک کو دیکھنے لگیں۔ جیسے چوری کرتے ہوئے رگے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں۔ امین نے ان کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا پھر گہرا سانس کھینچ کر دوا رہاں کی سمت متوجہ ہو گئی۔

”ملا! آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”کچھ نہیں کہہ رہی تھی یہ تم جاؤ۔“ دور ملک نے ہا کواری سے مداخلت کرتے ہوئے امین کو جانے کا اشارہ کیا۔

”بت باپ۔“

”بٹ نہیں کرو امین! جاؤ تم۔“ انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔ امین تذبذب کا شکار ملا کو دیکھتے ہوئے پلٹ کر چلی گئی۔ اس کے نغض ہی دور ملک چپے کی سی تیزی سے ان پہ چھپے تھے۔

”کیا کرنے جا رہی تھیں۔ بہت ہمدردی کا بخار چڑھ رہا ہے تمہیں۔ ایک بات یاد رکھو۔ وہ صرف تمہاری نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ بچا نہیں میں نے اسے۔ سلطان شاہ بہت ڈینٹ آئی ہے۔ خوش رہے گی وہ۔“ اس کے ساتھ ان کے بال ٹٹھی میں جکڑ کر زوردار جھٹک دیتے ہوئے دور ملک نے ان سے زیادہ کیا خود کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ پھر مزید بولے تو بچے میں سر دغا مٹ رہا تھا۔

”اگر تم نے کچھ بھی غلط کیا تو یا در کھنا میں طلاق دے دوں گا تمہیں۔ سمجھیں؟ امین کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے بس یہ بتا دو کہ اس بچے کو اس کا نکاح ہے۔“ دھکانے کے بعد وہ فن کرتے کرے سے نکتے چلے گئے تھے۔



”ماں! اکل تم کو یاد کیجئے گی تھیں؟“ خلاف توقع پاس بیٹھ کر سر میں ڈاٹی تیل ماں سے کنوری پکڑتے ہوئے خود ماش کرتے ہوئے اس نے مصومیت سے سوال کیا۔ ماں نے ٹھٹھک کر اس کی صورت دیکھی۔ البتہ اسے فرما دیا سمجھتے ہوئے جواب دینا ضروری خیال نہ کیا۔

”ماں! مجھے بھی ساتھ لے جاتیں ما۔ میں بھی دیکھتی موصوف کتنے خوب صورت ہیں۔“

”دھت تیرے کی۔“ ماں کے ہاتھ سے تیل کی بوتل چھوٹ گئی وہ بے حیا تھی مگر اس قدر ماں کو شاک نہ تو ہوا ہی تھا کیسی بے غیبتی سے لپے ہوئے والے دلہا کو خود دیکھنے کی خواہش ظاہر کر رہی تھی۔

”چل دفع ہو جاؤ۔“ ماں نے فرس پہ چھیلے تیل کو نظر انداز کر کے خوشو نظروں سے اسے گھورا۔

”کیا ہے ماں! کبھی تو بیارے بول لیا کر۔ اب ایسے کیا آنکھیں نکال رہی ہو۔ اس میں قیامت ہی کیا ہے۔ آخر آسیدہ آپا کا دلہا دیکھنے کی میری فرمائش بے جا تو نہیں۔ سالی ہوں میں اس کی۔“ لگی بات نے ماں کے چھکے چھڑا دیے تو یہ سمجھ رہی ہے ان کا جی چاہا ہمارے پیٹ لیں۔ آخر وہ کس جہاں میں گم رہی تھی۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو لڑکے کے دھنسنے دار آ کر بات پکی کر گئے تھے۔ انہیں شادی کی جلدی تھی جبکہ ماں کو ان سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ لہذا انکار کا جواز ہی نہیں تھا۔ ان کو ان کے در نجف کے ہاتھ پہ پیسے رکھے تھے اگرچہ آسیدہ بھی مو جوتھی۔ مگر ماں نے خشگیں لگا ہوں سے جی کو گھورا۔

”بات سن۔ شادی آسیدہ کی نہیں تیری ہو رہی ہے۔ اب اس شخص کو اکاری کو بھول جا اور بیاہ کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹا۔“ بال سمیٹ کر ماں اندر چلی گئیں۔ جبکہ در نجف کو یا دہننے کو ان کو پہن چڑھی۔ بہت دیر لگی تھی اسے خود کو سنبھالنے میں اور جب حواس بحال ہوئے تو خود ناتی ہوئی ماں کے سر پہ پتلی تھی۔

”کیا ماں تم میری شادی کر رہی ہو۔ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ سن لو مجھے فلموں میں کام کرنا ہے، بس۔“

ماں پہ مطلق اثر نہ ہوا ہے پرواہی سے کس کھولے اور کپڑے لیے اور زیورات نکال کر دیکھتے ہوئے خوش ہوتی رہیں۔ ان پر اپنی بات کا اثر نہ دیکھ کر وہ جیسے ملگ اٹھی۔

”میں آگ لگا دوں گی ان سب کو بھی اور تمہارے اس سر کو بھی۔“ خبردار ماں جو میری شادی کا نام بھی لیا۔“ وہ جیسے دیوانی ہو گئی۔ زرق برق جوڑے اٹھا کر پھینکتے ہوئے چیخ پڑی۔ ماں نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”کیا کرے گی تو۔“ ہاں کیا کر سکتی ہے۔ اسے ہاؤلی ہوئی ہے۔ مرداوت بیار اچھ ہے۔ بہت پیار ہے تو اپنی قسمت پر ناز کرے گی۔“ اسے آنسو بہاتے دیکھ کر غصہ کرنے کے بجائے بیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”جھاڑ میں جائے وہ مجھے نہیں چاہیے ایسا ہی بیار ہے تو آسیدہ آپا کی کرو۔ ماں میری نہیں اور سن لو اگر تم نے اب بھی میری بات نہیں مانی تو میں گھر سے چلی جاؤں گی۔“ اس نے جس قدر اشد حال سے جواب دیا تھا۔ ماں ٹھٹھک سی گئیں وہ اتنی بد حال اور سرکش تھی کہ ایسا قدم اٹھانے سے بھی نہ چوکتی۔ ماں نے خاموشی میں عافیت جانی اور چپکے سے اٹھ کر باہر آتے ہی دروازے کی کنڈی لگا دی۔ در نجف تو جیسے نیم پاگل ہو گئی۔ چیختے ہوئے دروازہ دھڑ دھڑاتی رہی مگر ماں کانوں میں تیل ڈالے اپنے کام میں مگن ہو گئی تھیں۔



ڈیرنگ ٹیبل کے آگے میں سلطان شاہ کا بھرپور جاہت لیے شاندار عکس جھلما رہا تھا۔ سیاہ سوٹ پہ سرخ مٹائی نے چہرے کی سرخ و سفید رنگت کو بڑے پرکشش بنا ڈالا تھا۔ بال

برش کرتے ہوئے تقدیر کی نگاہوں سے اپنا جائزہ لیتا وہ جانے کس سوچ میں تھا کہ آنکھوں میں واضح منظر ابھرتی تھی۔ خادم حسین پر قیوم کی بولی پکڑے گھوم گھوم کر فریاضی سے اس پر چڑھ کر رہا تھا۔

”اب تم جاؤ خادم حسین۔“ سلطان شاہ ہاتھ اٹھا کر ٹوکتا ہوا اور برش ڈرینگ ٹبل پہ اچھال دیا۔ خادم حسین نے سر تسلیم خم کیا۔ اور بول ٹبل پہ سجا کر سرعت سے پلٹ کر باہر چلا گیا۔ سلطان شاہ کا کئی پر دست و آج باندھ رہا تھا جب دروازہ اوپن کر کے ایک باز کد نام دلکش لڑکی اندر آئی تھی۔ سلطان شاہ نے کچھ بھی ڈانٹا کو رائن کیا جبکہ وہ کچھ بھی کہے بنا اس کے قدموں کے نزدیک کارپٹ پہ دوڑا تو وہ کمر بیٹھے کے بعد اسے موزے اور جوتے پہنائے گئی۔ ”اسلمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ خادم حسین کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔“ فریاضی حاصل کرنے کے بعد اب وہ سر اٹھائے بہت جھنجھکے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔ سلطان شاہ کچھ کا زور یہ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔

”جو قوف ابد عورت۔ اگر وہ ٹھیک نہیں تھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اس سلسلے میں اس کا بوجھ ہے حد بزم ہو گیا۔ غور یہ ہم کر رہی گئی۔“

”ہو رستے سے۔“ پاؤں سمیٹتے ہوئے وہ بھر پور تکی سے بولا تھا۔ غور یہ پہلے ہی پٹپٹا چکی تھی گڑبڑا کر پیچھے ہٹے ہوئے دیوار سے جا لگی۔ سلطان شاہ موبائل اٹھا کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ ”خادم حسین“ برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہی اس نے مخصوص انداز میں پکارا۔

”حاضر سرکار۔“ خادم حسین بولنے کے جن کی طرح حاضر خدمت تھا۔

”کریم بخش سے کچھ اسلمہ کو لکھ دیک لے جائے۔ اگر سیریل مسئلہ بچھ مجھے فون کروے۔“

”جی سرکار۔“ خادم حسین سر ہلا کر اس کا اشارہ ملتے ہی پلٹ گیا جب کہ سلطان شاہ کے قدم پور ٹیوکے سمت اٹھ رہے تھے۔



کنفی ہی دیر تک تو اسے اپنی ہاتھوں پہ مشغول ہوا تھا۔ مگر جب ملانے دیا ہوا رہا۔ بارہا ہاتھ بچتی بچتی آنکھوں سے آنکھیں جکتی ہوئی غیر یقینی سے بولی تھی۔

”لما کیا کہہ رہی ہیں آپ میرا نکاح اور وہ بھی ابھی اسی وقت۔“ اس کے سر پر تو کیا دھما کیا گیا تھا، جو ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ گھر آتے ہی مانے یہ مڑ دھنپا تو محسن کا احساس جانے کہاں جا چھپا۔ حیرت کی جگہ اب غم و غصے نے لے لی۔

”آپ نے مجھ سے پوچھا تو دور کی بات بتانا تک کو رائن کیا۔“

”جیسا بتاتا رہے۔“ لاما نظریں جھرا کر بولیں انہوں نے کبھی تصویر بھی نہیں کیا تھا زندگی میں کبھی اس درجہ بھی بے بسی کا مقام آئے گا کہ اپنی اولاد کے سامنے ہی مجرموں کی طرح سر جھکا پڑے گا۔ داور ملک کی دھکیوں کے باعث انہیں مجبور ہونا پڑا مگر انہیں کو انہوں نے دانستہ نہیں بتایا۔ وہ بھی ان کی طرح تھی تو بے بس قتل از وقت آگئی کے عذاب سے بچانے کی خاطر انہوں نے اسے بے خبر رکھنا مناسب خیال کیا تھا۔ مگر انہیں کاروبار میں انہیں پریشان کرنے کو کافی تھا۔ اس نے آسان سر پہ اٹھایا تھا۔

”آپ نے سوچا بھی کیسے اما کہ میں پاپا کے ہاتھوں میں کھینچ لی بن جاؤں گی۔ دیکھو مجھے آپ پہ بھی ہے۔ اگر آپ پہلے بتا دیتیں تو..... میں یہ شادی بالکل نہیں کروں گی۔ بتا دیں پاپا کو کیا کر سکیں گے وہ میرے میں بالغ ہوں اپنا فیصلہ کر سکتی ہوں۔“

”ایما! ایمن جیٹا۔ سلطان شاہ آپ کا بے قاضی صاحب تیار ہیں تم تھیں ہو گئی ہو۔ میں بے حد پریشان تھی تمہارے پاپا۔“

”یہ دوسرا امت ڈرائیون مجھے پاپا سے یہ ان کی بھول ہے میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ سختی سے بولی تو لاما غافل سی ہو گئیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ انہوں نے ہم کر اس کے پیچھے سے ہوئے روپ کو دیکھ تھا۔

”مطلب میں یہ شادی نہیں کر رہی۔“ اس نے بے خوف لہجے میں کہہ کر تپائی کو دور سے ٹھوکر سیڑ کی تھی۔

دست و پیر میں ڈرائنگ روم میں اس وقت چار کواہن کے علاوہ تاحی صاحب اور داور ملک بھی موجود تھے۔ بلا ٹیکسٹ صوفے پر سلطان شاہ تھیں زانو بے بہت شاہانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک باز صوفے پہ بچھلایا رکھا تھا۔ خادم حسین اس کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے موزا بن انداز میں الٹ کھڑا تھا۔ داور ملک صوفے پہ پہلو بدلتے ہوئے فطری انداز میں دست و آج بچھال کر کسی عمیق سوچ میں غرق ہو جاتے۔ ان کی ایک ایک جنبش سے فطرب و بے قراری کا عنصر جھلک رہا تھا۔ سچی دروازہ کھول کر ملازمہ اندر آئی تھیں۔

”صاحب ابی بی کہہ رہی ہیں میں یہ جوڑا نہیں پہنوں گی۔“ بازو پٹکا پیر ایمل ڈریس آگے کرتے ہوئے ملازمہ نے منہنا کر کہا۔

”کیا بد تمیزی ہے۔“ داور ملک کا موزہ بری طرح سے گڑا تھا ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھتے ہوئے انہوں نے معذرت خواہانہ کچھ حاضرین پہ ڈالی۔

”میں معذرت چاہتا ہوں سلطان شاہ میں ابھی آتا ہوں۔“ سلطان شاہ کی سولہ نگاہوں کے جواب میں محض اتنا سا جملہ اس کی تشفی کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ معاملے کی گھمبیر تا کے پیش نظر ایک پل میں مسئلے کی نوعیت جان کر انہیں ٹوک گیا۔

”وہ اسے منٹ۔ داور ملک آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں۔“ وہ ان کے قریب آگیا۔ داور ملک کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر سلطان شاہ کے سر ہٹا کر خود کچھ کرارادہ ہوتی کر دیا۔ سلطان شاہ ملازمہ کو اشارہ کرنا ہوا اور اوڑھے سے نکل گیا۔ ملازمہ بی کی رہنمائی میں وہ ایمن کے بیڈ روم تک رسائی پاس تھا۔

”لما! صرف آپ کی خاطر میں نے یہ قربانی دی ہے۔ اب اور کیا چاہتی ہیں۔ بن تو گئی ہوں قربانی کا کرا۔“ سلطان شاہ نے رک کر ان کی بات چیت پہ دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دھڑلے سے دروازہ کھلتے ہی اما کے ساتھ ساتھ ایمن نے بھی میکانیکی انداز میں پلٹ کر دیکھا۔ مقابلے پہ جوڑے ہوئے کو کو کچھ کر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ سلطان شاہ کے اشارے پر ملازمہ کمرے پہ بیڈ پر ڈال کر واپس چلی گئی۔ مقدم برصا کر فاصلہ سمیٹتے ہوئے سلطان شاہ ایمن کے قریب آکر اس کا ہڈا کی لڑائی ایمن جانے کیوں اس سے کٹھن دھکی ہو گئی۔ شاید اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ یا پھر سلطان شاہ کی ترویج کروینے والی نگاہوں کا اثر تھا کہ وہ ان جاوید اثر آنکھوں میں زیادہ دیر کچھ نہ جھلپائی نظر کا زور یہ بدلتے ہوئے ہلکا سا رخ موڑ لیا۔ دراصل وہ اپنی لپٹائی اس پر غائب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سلطان شاہ نے ہاتھ برصا کر ایمن کی کلائی آہنی گرفت میں جکڑتے ہوئے جھٹکے سے رخ پھیر کر اپنی جانب کر لیا۔

”اُمی! تھک تمہیں سلطان شاہ کی دلچسپی مناسب لگے گا۔ نہ کہ جو میں باری ہوئی متاع کی حیثیت سے لپے آپ کو میرے سامنے پیش کرنا۔“ سلطان شاہ نے پرسکون رہتے ہوئے بھی ایمن ملک کی ہستی کی عمارت کو گرا دیا۔ ایک ہلکے سے جھٹکے سے اس کی ذات کے نیچے کو لہر کر کھڑے۔

”تمہیں شاید تمہارے والد گرامی نے یہ نہیں بتایا کہ نکاح میں ان کی درخواست پر کر رہا ہوں۔ نو پر اہم مت پہنویہ ڈریس۔“ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تو میں نکاح ضروری نہیں سمجھتا۔ جانا تو تمہیں میرے ساتھ ہے ہی۔ ان فارمیٹرز کو نہ بھی بتایا جاتا ہے تو.....“ اسے بھندو بھٹکا ہوا وہ بہت خوب صورتی سے اس کی قوالت دیا دلا گیا تھا۔

ایمن ملک کے اندر بہت آہستگی سے کچھ ٹوٹا تھا اور ٹوٹا چلا گیا۔ وہ غلط کب کہہ رہا تھا۔ ممی کچھ تھا آنکھوں کے فرش خم ہوئے کھٹکے کو بے تاب ہوئے۔ جب اس نے بیڈ پر دھرا دوزخا جوڑا اٹھایا تو تیزی سے ڈرینگ روم میں گھس گئی۔ سلطان شاہ نے ایک کچھ غلط انداز اما کے پیچھے وجود پر ڈالی اور قدموں کا رخ موزا لیا۔ یہ کچھ تھا و صرف جینے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ یہ خیال اس کی اکثری ہوئی گردن کے کلف میں اضافے کا باعث بنا تھا۔



اس کا رواد و سماں سب دھری رہ گئیں۔ شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ ملاں اور آسیر نے اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر فرج کیا تھا اور بہت شان سے اسے رخصت کیا۔ وہ جو دھمکی دیتی تھی۔ عین نکاح کے وقت انکار کر دیں گی۔ کچھ بھی نہ کر پائی۔ یوں زردی سے سر لوامہ کی دلہن بنا دیا گیا۔ اس کی پور پور اس انجان شخص کے لیے جانی گئی۔ اسی کے نام کی ہندی ہاتھوں پر ہبک اٹھی تھی۔ ملاں بے حد خوش اور سرشار تھیں۔ آسیہ بھی اس فرض کی ادائیگی پہ خاص مخلص دکھائی دے رہی تھی۔ اسی درجنف کی خاطر اس نے اپنے آپ کو مار کر آٹھ پورا کارنی کا ذریعہ معاش اختیار کیا تھا۔ آج اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لبا کے سامنے سرخو ہو گئی ہو۔ آج بے کیا وعدہ تھا کہ خود کو ہلکا چھٹا محسوس کر رہی تھی۔ درجنف پیچھے کے بت کی مانند ماسک و مسامت ہر احساس سے عاری محسوس کر رہی تھی۔ اس کی سکھیاں سر لوامہ کے نام سے اسے چھین رہی تھیں اور جانے کیا کیا سرکوشیاں کر رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہ نپائی۔ آنکھوں کے سامنے تو بکھرے خواب کا چٹن بن کر گر رہے تھے۔ آنسو کہیں اندر دم کر رہے گئے۔ پھر وہ لوامہ کے سنگ رخصت ہو کر ملاں کی دلہیز پار کر گئی لیکن دل میں جو طوفان مچل رہے تھے وہ تھینا مرام لوامہ کی زندگی میں بجا ہی لانے والے تھے۔ اس کی یہ خاموشی کسی طوفان کا ہی پیش خیمہ ثابت ہونا تھی۔



جس وقت گاڑی سیاہ آہنی گیٹ کے اندر رواں ہوئی رات کی سیاسی پوری طرح بچھل چکی تھی۔ ایمن ملک فرٹ میٹ پر سلطان شاہ کے مقابل بیٹھی خالی لڑہنی سے کوہ میں رکھے ہاتھوں کو ٹکے جاری تھی۔ سلطان شاہ نے ایک بار بھی اس کے بچے سمورے سر پہ کچھ بھر کے دیکھنے کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ گاڑی رکتے ہی خادم حسین بنگلی کی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور لپکتے ہوئے سلطان شاہ کے لیے دروازہ کھول دیا۔ سلطان شاہ ای غنوت و غنوت سے سر اٹھائے گاڑی سے باہر آ گیا۔

”تم جاؤ خادم حسین۔“ خادم حسین کو گاڑی کے گرد گھوم کر دوسرا دروازہ کھولتے دیکھ کر سلطان شاہ نے بھاری آواز میں حکم دیا۔ خادم حسین سلام کرتا سر ہٹ کر اوڑھ کر جانب چلا گیا۔ سلطان شاہ قدم بڑھا کر اس کی سمت آگیا۔ ایمن ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔ اسے دیکھ کر بے اختیار کسی مومی جسم کا تصور ذہن میں ابھر رہا تھا۔ سلطان شاہ نے ذرا سا جھک کر دروازہ کھولا۔ اگرچہ دروازہ کھلنے کی آواز اس نے جتنا تار یک اور نسان ماحول میں ارتعاش کی مانند ابھری تھی مگر اس کے ماسک وجود میں کوئی تحریک پیدا نہ ہوتے دیکھ کر سلطان شاہ کی صحیح پٹائی ممکن آوے ہو گئی۔

”اُو! اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا کر وہوٹھے پن سے بولا تھا۔ ایمن اس کی بھاری آواز سن کر یوں چٹکی جیسے گہری نیند سے ہڑبڑا کر جا گئی ہو۔ کچھ دیر غائب دماغی سے سلطان شاہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ دیکھا۔ پھر سرد آہ بھر کے اپنا باز کد سناٹائی ہاتھ اس کے پر صحت بھاری ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ کیا اس کے ہاتھ میں گیا کہ جب سے سوئے جاگے سے احساسات یکبارگی بیدار ہو اٹھے۔ پورے وجود میں سسکی سے بھر پور بھر میں سرایت کرتی چلی گئیں۔ اس انوکھے احساس نے ایمن کو پل بھر کے لیے بھونچکا کر دیا۔ بھاری لباس سنبھالے ہوئے آہستگی سے باہر آئی تو پہلے ہی قدم پہ چلنے میں شدید دشواری محسوس کر کے بے ساختہ ہی سلطان شاہ کی سمت دیکھا تھا۔ اسی ہی سلطان شاہ کی نظر بھی اٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سمجھتے ہوئے ہٹا کسے تر دود کے سلطان شاہ نے نہایت استحقاق بھرے انداز میں اپنا بازو اس کی کمر کے گرد جھانک کر دیا۔ ایمن کے پورے

وجود میں جیسے کوئی برقی روداد لگی۔ سلطان شاہ سے یکا یک ہی بے حد جھجک محسوس ہوتی تھی۔ جبکہ وہ ہر احساس سے عاری اسے یوں ہی سہارا دیے اندرونی حصے کی جانب لایا تھا۔ لان اور برآمدے سے ملتی بیڑھیوں کے آغاز پر فوزیہ نے سسر کرتے ہوئے انہیں ویش کیا اور یوں ہی سسر کرتے ہوئے پھول نچھاور کر دیے۔

”ابھی کھڑی رہیں آگے آتے موت نظر آتی تھی۔“ سلطان شاہ کی اس سر و پھٹکار پر امین بوجھل پلکیں اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ سلطان شاہ کا چہرہ غیض و غضب کی تصویر بنا نظر آیا جبکہ سفید لباس میں وہ گلابی سی لڑکی خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔ ایک ہی نگاہ میں امین نے فوزیہ کی بیرونی سی دقتی آنکھوں میں لدتی نمی اور وحشت کو پایا۔ وہ جاننا چاہتی تھی فوزیہ کے بارے میں۔ ذہن کے کسی کونے میں اس خیال نے بھی جگہ پائی تھی۔ شاید لازمہ ہو مگر فوزیہ کے طے نے سختی سے اس بات کی تردید کر دی تھی۔ پھر کون ہے یہ؟ ایک سوائڈنٹان تھا۔ دراصل ابھی کچھ دیر قبل سلطان شاہ کے کس نے اسے جس نے احساس سے دوچار کیا تھا اسی کے باعث امین کو اس لڑکی کا زہر شکن حسن خائف کر گیا تھا مگر یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ جیسی اس نے بلکوں کی چٹن کر اتے ہوئے ہونٹوں کو سختی سے چھینچ لیا۔



بیڈروم سادگی و گرافت سے سجایا گیا تھا اگرچہ اس کے آدوش کے مطابق تو نہیں تھا مگر تازہ و انہی نہیں۔ گھر بھی اس کے گھر کی نسبت بہت بڑا اور خوب صورت تھا۔ کچھ دیر قبل ہی درجنف کی نند نے گھر دکھانے کی آفر دی تھی۔ جسے اس نے نہایت بد چالطی سے رد کر دیا۔

”اوکے پھر آپ بھائی جان کے ساتھ کچھ لیجیے گا۔“ نندا گواری چھپا کر سسر کرتے ہوئے بولی پھر اسے ویش کرتے ہوئے مزید روکے بنا کر سے سے چلی گئی۔ درجنف تب سے گردن گھما گھما کر جائزہ لینے میں لگی تھی۔ دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی دل عجیب بے ہنگم سے انداز میں دھڑکا۔ جسے اس نے نہایت سختی سے اس گستاخی پر ڈانٹ دیا۔ نگاہ جھٹک کر ڈرائیونگ ٹیبل کے آگے بیٹھ گیا۔ دروازے پر اسے اپنے دلکش روپ پہ جا پڑی۔ بلاشبہ یہ دن عروسی لباس میں اس وقت وہ ڈاکٹر ایک اپ اور طوائف زبورات سے سچی آمان سے تری در دکھائی دے رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ دروازے پر آن کے رک کر جب اس نے اپنے طعنائی عکس سے نگاہ ہٹا کر سر جھکا لیا اس وقت بھی یوں لگا۔ جیسے دلہن کے گیٹ اپ میں وہ کیلیم کی شوٹ پر ہے۔ یہ خیال خوش کن تھا۔ وایتی انداز میں سٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے دل کی دھڑکنوں کو شمار کرنا چاہا تو حیرت انگیز طور پر ان کی انوکھی ترتیب پر ٹھٹھک سی گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ پھر ٹھٹھک سے بندھنے کی آواز ابھری۔ یقیناً لاک ڈنگ لگایا گیا تھا۔ درجنف خود کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔ کسی طرح اسے کھری کھری سنا کر اپنا پوائنٹ آف ویو واضح کرنا ہے۔ کمرے کی فضا میں پھلتی پھٹتی مسکون مردانہ کلون کی سہک کسی کی آمد کا دل دھڑکا دینے والا احساس بن کر اس کے اعصاب پر تملہ آور ہوئی تھی پھر کوئی آہستگی سے چلا ہوا اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ وہ غفلت وار سہک اب براہ راست اس کے دامن پہلو سے اس پر گرفت مضبوط کرنے لگی۔ درجنف نے پھر سے دل میں تجدید عہد کیا تھا۔ بھاری خوب صورت صاحب اس کے آس پاس ٹھکراب سلام کیا گیا تھا۔ جس کا جواب دینا اس نے ضروری خیال نہیں کیا۔

”میں نے سنا تھا آپ بہت خوب صورت ہیں۔ آپ کو دیکھ کر یقین آ رہا ہے۔“ گھمبیر سر کو شانہ ظلم کھیرنا لیوہ اس کی ہاتھوں پہ فوس ٹھکنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ مایا لیا گیا۔ درجنف نا کواری ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر جانے کیا ہوا ذہن بالکل تاریک ہو گیا ایک دم سب اس نے گھبرا کر نگاہ لوٹ لی کی اور ہاتھ کھینچنا چاہا مگر نگاہ تک پہنچ کر ہی ٹھٹھک گئی اس کا چہرہ سا ہاتھ جس ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ وہ کوئی نام ہاتھ نہیں تھا۔ غرض دل کی لگیوں سے جاسرخ و سفید مضبوط ہاتھ تھا جس کی نیکی گلابی اور جلد بے پناہ شفاف تھی۔ اس قدر شفاف کہ جلد کے نیچے ہری سوں کا جال نمایاں تھا۔ چوڑے چوڑے صاف سحرے ناخن ہاتھ کی پشت پر موجود سیاہی والے ہاتھ اتنا بھر پور ہے تو خود کیا ہوگا؟ یہ سوچ بہت سرعت سے دماغ میں گھسی تھی۔ اسے اپنی سہیلوں کے شوخ فقرے یاد آنے لگے جو انہوں نے دلہا کی تعریف میں کہے تھے۔ مگر تب اس نے غم و غصے کی زبانی دتی کے باعث توجہ سے نہ سنے تھے مگر اب اندر چھپنے والی اسے دیکھنے کی خواہش شوریدہ مہر کی صورت میں اسے بے بس کر گئی۔ ایک جھٹکے سے سروٹنچا کر کے اس نے مرواؤ کو دیکھا اور بیہوش رہ گئی۔ سفید کھٹ دار شلو اور سوٹ میں گاؤٹیسے سے ٹیک لگائے وہ قدرت کی منائی کا غمگین شاہکار دکھائی دے رہا تھا۔ بیانیاتی ہوناؤں کے سے دلکش نقوش سمیت مردانہ وجاہتوں کا مکمل نمونہ وہ شخص مسر کرتے ہوئے ہلکا سا اس کی سمت جھک کر آیا تھا۔ کوپارنگ پہنار ہاتھ اب اسے مسر کر رہا تھا۔ پلکیں سبک چھپائے بنا وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ جانے اسے یقین نہیں آ رہا تھا شاید لال پر یا پھر اپنی قسمت پر کیا وہ اس قدر خوش نصیب تھی کہ اتنا کش مراد اس کے حصے میں آیا تھا۔ مراد اسے رنگ پہنار کر سیدھا دو اتو اسے یوں خوبیت سے اپنی سمت دیکھتا پکار پھلتا چوڑا پھر چلی سا دھڑک رہی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟“ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے اس نے درجنف کی کمریت کو کھیر دیا۔ درجنف چونکی تھی۔ پھر دھیمے سروں میں ہنس دی۔ مرواؤ بارہ تھکے سے ٹیک لگاتا ہوا اسے مخاطب کر گیا۔

”درجنف! اس گھر میں آج سے قبل میں تمہارا لیکن اب آپ آگئی ہیں تو سب کچھ آپ کے حوالے مجھ سمیت کیا آپ سنبھالیں گی؟“ اس کا ہاتھ پکڑ کر مراد نے اس کی آنکھوں میں چھانکنا وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پناہیت سے بولی تھی۔

”ہاں خوشی سنبھالوں گی آپ سمیت۔“ اس نے ٹھٹھکا ہوا سنا ہاتھ بقیہ کھیرتے ہوئے مرواؤ کے فراغ سے غصے میں منہ چھپایا۔ مرواؤ اسے شانوں سے قہار چکا تھا ٹھٹھکا مایا گیا۔ آنکھوں میں ملتی جوت یک دم مدہم پڑ گئی۔

”کیا ہو مرواؤ؟“ جب اس کی طرف سے خاصی دیر تک کوئی پیش رفت نہ ہوئی تب درجنف نے سر اٹھا کر تھیرا تھیرا جیرا لگی سے استفسار کیا۔ مرواؤں چونک گیا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔

”اے میں کچھ نہیں۔“ وہ گڑبڑا سا گیا پھر اسے دور بٹاتے ہوئے رسائیٹ سے بولا تھا۔

”آپ پہنچ کر لیں تھک گئی ہوں گی۔“ ڈرائیونگ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اسے دیکھے بنا میگزین اٹھا کر وین گردانی شروع کر دی۔ درجنف کا موزیک مٹی ہی خراب ہوا تھا۔ بی جا ہا آگے بڑھ کر میگزین چھین کر کھڑے کھڑے پھر اسے بتائے وہ جھٹکی نہیں ہے۔ تنھن تو کیا غصہ قہر سب کچھ ہی اسے دیکھنے کے بعد کہیں چھپ گئے ہیں۔ مگر مرواؤ کے موزیک کے متعلق اسے بالکل آگاہی نہیں تھی جیسا کہ کچھ کچھ گئی البتہ یہ میگزین اس وقت سخت زہر لگد ہاتھ کچھ دیر بعد واپس آئی تو آٹھ ڈسک میں تھی۔ مرواؤ نے آہٹ پر سروٹنچا کیا۔ ایک بار پھر اس کے صبحی چہرے پر ٹھٹھکیں نمودار ہو گئیں۔ اس ناکی کا گلا انتہائی ڈیپ تھا اور فنگنگ بالکل اچھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی دو شب خوابی کے لباس تھے۔ مگر درجنف نے جانے کیا سوچ کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ اب پہنچ کر اس نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور میگزین بند کر کے رکھنے کے بعد اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

”آجائیں۔“ درجنف نے اپنا ہی نہیں پورے کا پورا وجود خوشی اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی پلاننگ بھول چکی تھی۔ اس وقت یاد تھا تو بس یہی کہ اس کا شوہر بہت ہینڈم بور باوقار ہے۔ وہ پوری طرح اس کے حسن کی اسیر ہو چکی تھی۔



جس طرح گھر کی ایک ایک شے سے لاریت چک رہی تھی اسی طرح یہ بیڈروم بھی لیکن کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کر رہا تھا۔ ہر شے بہتر سے بہترین ہو رہے تھے۔ کمرچٹ سے لے کر پروں تک ہر چیز میں میچنگ کا خیال رکھا گیا تھا۔ بلور آف وائٹ کے کبھی نشین سے سجایا خواب آسا بیڈروم اس قدر ازخاک انداز میں ڈیکورینڈ کیا گیا تھا کہ وہ سب کچھ اوش کیے جائزہ لینے میں لگی تھی۔ اگرچہ وہ دھیمی سیٹھ دور کی بیٹی تھی مگر اس بیڈروم کی آرائش نے وقتی طور پر ہی لیکن اسے لے کر سحر میں جکڑ لیا تھا۔ اس نے اپنے لباس فاخرہ پہنا ڈال دی اور پہلی بار چونک گئی۔ ورنہ گنا گھرے اور وہ پنے پوسنے کی تاروں کا نقش جال بنا ہوا تھا۔ بہت پیسہ سلطان شاہ کے پاس چھپا تو آج میں اس کی بیج جھانے ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند چھل گیا۔ دل اس میں لیل پر لاسرو نہ سکتے لگا۔ کبھی سوچا تھا یوں جوئے میں ہار کر اس قدر بے بس ہو جائے گی۔ آنسو پلکوں کی بارش چھلانگائی چاہتے تھے کہ سلطان شاہ کی آمد نہ ہو۔ وہیں خشک کر ڈالا۔ سلطان شاہ ازلی بے نیازی سے اسے نظر انداز کیے یوں مصروف تھا جیسے اس وقت کمرے میں امین ملک کا جیتا جاگتا وجود سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اس کی ایک ایک اول سے بے نیازی جھٹک رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے لاکر کھول کر ایک ٹھیکس کیس نکال کر امین کے قریب رکھا تھا۔ پھر کپڑے نکال کر ویش میں گھس گیا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے امین مسلسل پانی کے گرنے کی آواز سن رہی تھی۔ اگلے چند لمحوں کے بعد وہ ایک بار پھر واروہا بیوہ جنر بیوہ بنان پینے وائٹ تولیہ گلے میں لٹکائے وہ اب بھی اسے نظر انداز کیے اپنے معمول کے کام گزار رہا تھا۔ امین نے جھٹکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ شرٹ لیکن کر ڈرائیونگ ٹیبل کے سامنے رک کر بال بنائے پرفیوم سپرے کیا اس کے بعد غرض سے لمبی گردن والی بوتل نکال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گھونٹ گھونٹ دھچلولی اندر رانا تار رہا۔

امین پوری آنکھیں واکیے اسے کچھتی رہی۔ سلطان شاہ کو رڈ کرتے دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ دکھو اپنا نصیب برابر ہونے پر تھا۔ وہ جانے کیا کیا سوچتی اس کا جائزہ لیتی رہی۔ دیکھنے میں تیس تیس سے زیادہ نظر نہیں آتا تھا۔ خوب صورت نقوش سے سجافروہ بے نیاز چہرہ دلکش اور گہری آنکھیں جن پر خم دار پلکیں اس مفرور چہرے کے تازہ کو سدا کر معصومیت کا تاثر دینے کی کوشش میں مصروف تھیں اس پہ غضب کی دراز تا مات بھلا کس شے کی تھی اس میں مگر پھر بھی وہ ایک برائی تھا۔ سلطان شاہ نے اچانک سر اٹھا لیا اسے یوں پوری توجہ سے اپنی سمت متوجہ پا کر زہر خند سے ہنس پڑا۔ امین کو یوں لگا جیسے اس کا ستر اڑا لیا ہو یا جیسے اپنے حسن کی آگاہی پھر کر کے ہٹا ہو۔ امین کو یکبار اپنی غیر اخلاقی حرکت پتاؤ آیا تھا۔ نگاہ ستر اتے ہوئے اس نے نہ صرف سر جھکا لیا بلکہ رن بھی پیچھ لیا۔

”کیا بات ہے رؤفانی! پسند نہیں آئی جو کھول کر دیکھنا تک کو ارا نہیں۔“ بیڈر بیٹھتے ہوئے کیس کی سمت اشارہ کیا جو ابھی تک ویسے ہی رکھا تھا جہاں وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ امین کی سمت سے جواب نہیں آیا۔ شاید سلطان شاہ کو ضرورت بھی نہیں تھی۔ جیسی دھیان دیا۔ باجیلوری بکس اٹھا کر اٹھوٹھے اور انگلی کے دباؤ سے کھولا تھا۔ وہ اس آ بیٹھا تھا۔ اس کے وجود سے سختی سہک امین کو اپنے حصار میں جکڑ گئی تھی۔ اس کا نازک سراپا ہولے ہولے پکپکانے لگا کیس کھل چکا تھا۔ اب شعاعیں کھیرتے ہیروں سے مزین بھاری ٹیکس سلطان شاہ کے ہاتھ میں تھا۔ سلطان شاہ نے اس کی سمت جھک کر وہ ٹیکس امین کی گردن کے گرد پیٹ دیا۔ لب وہ اسے لاکر رہا تھا۔ سلطان شاہ کا چہرہ اب امین کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھا وہ ٹیکس پہنار ہاتھ۔ امین کی گھبرائی کٹر لائی سی نگاہ اس کی سمت اٹھ گئی۔ اس وقت وہ پورے کا پورا اس پر جھا لیا تھا۔ اسے اپنے خواب یاد آ کر ذامت سے دوچار کرنے لگے۔ ایسا ہی بی واروہو اور اکھڑ سا وی مریسند کر رہی تھی۔ وہ جو عورت پر چھا جانے والا ہو جکڑ لینے والا ہو۔ سب کچھ تھا سلطان شاہ میں مگر اب اسے اپنی ہی سوچ سے شرمندگی تھی۔ سلطان شاہ صرف اس پر چھایا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے تو امین ملک کی ذات کو سرے سے ہی قسم کر ڈالا تھا۔ جب سے وہ اس کے سامنے تھی ایک لفظ بھی تو نہ کہہ پائی تھی مگر اب اسے احساس ہوا تھا۔ سلطان شاہ جیسے بندے کے سامنے اپنی کہانی بڑی بات تھی اپنی کرنا اور معوانا بعد کے صحر کے تھے۔



اگلی صبح کا سورج زیادہ ہی روشن اور چمکیلا تھا یا اسے محسوس ہوا۔ ابھی تک وہ رات کے پرسوں لحاظ کے سحر سے نکل نہ پائی تھی۔ مگر احمد کی قربت کا نشانہ انگ میں سرمایت کر رہا تھا۔ صبح نو بجے سے پہلے اس کی آنکھیں کھل چکی۔ ہاتھ لینے سے پہلے اس نے مرلو کو جگایا۔ مناسب خیال نہ کیا۔ نہاد کو کر باہر آئی تو مرلو کو بے خبری کی نیند لیتے دیکھ کر مسکرا دی بال تو لپے میں لیٹ کر اس کے سر پر ہاتھ پٹی۔ مرلو نے نیند میں کھسک کر بولی تھی۔ اب اس کا بیٹھنا سناؤ خیر تر تھا زہر ہر گز اور راست درخرف کی آنکھوں کی زبرد آگیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مرلو کی آنکھوں کو چھوا تھا۔ یہ احساس ظہیر اور مست کر دینے والا تھا۔ نہایت آہستگی سے وہ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو چھو کر محسوس کرتی رہی اور اپنی خوش بختی پر نازیں ہوتی رہی تھی۔ مرلو نے ایک دم ہی آنکھیں کھل دیں۔ یکا یک ہی درخرف کو یوں لگا جیسے تاریکی میں دن کی روشنی پھیل گئی ہو۔ وہ اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دی۔

”اشھوہر ادا ہوا تھ لے لو۔“ مراد چوک سا گیا۔

”اوہ مائی گڈنئس آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ میری نماز قضا ہو گئی۔“ وہ نہایت سادہ سے لہجہ میں ایک جھٹکے سے ستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مرلو کے چہرے پر آنکھوں میں نماز کے قضا ہونے کا جو مسرہ سا ہاتھ تھا اس نے درخرف کو گنگ کر ڈالا تھا۔ مراد اوش روم میں گیا تب دروازہ بند تھا۔ درخرف نے اٹھ کر دروازہ کھولا آنے والی لڑکیاں۔ قیدنا اس کی مندی تھیں مگر اس نے اسی غصت و رنجش سے انہیں منہ نہیں لگایا۔ بے چاری کھسیانی ہو کر خود ہی اٹھ گئیں۔

”بھائی! آپ تیار ہو جائیں ہم ہاشٹہ لاتے ہیں۔“ اسے بالوں سے لکھتے دیکھ کر وہ غبات مناتے ہوئے کہہ کر چلی گئیں۔ درخرف نے دھیان نہیں دیا۔ مرلو کے ساتھ ہی اس نے ناشتہ کیا تھا اور فریڈرک کا خوب بھاری لباس پہن کر میک اپ بھی کر لیا۔

وہ ایسے کی تقریب رات کی تھی۔ مراد اسی مسئلے میں انتظام دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس بیٹھنے کا موقع کم ملا۔ ایک آدھ بار آیا بھی تو اپنے کام کی غرض سے۔ بلکہ آہنی کلف دار شلوار سوت میں جس پر پ بپ ٹینکس پر پچکی تھیں۔ وہ اس گھر کیلئے سے چلے میں بھی بہت شاندار نظر آیا۔ سب سے جدا اور ہر کسی پر چھایا ہوا۔ درخرف کی حضور کا ہیں اس پر اٹھ کر بٹا بھول رہی تھیں۔ جبکہ اس کے سمراد کی قدر تھا فل مرت رہا تھا۔ کچھ ہوں تک پر پابندی لگا رکھی تھی۔ درخرف کو مرلو کی اس درجہ غصت پر غصہ بھی آیا مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ وہ اپنی بہنوں اور کزن کی وجہ سے محتاط ہے اور واقعی ایسا ہی تھا۔ ویسے کی تقریب کے بعد رات کو تنہا ہوتے ہی مراد اس سے غافل نہ رہا۔



”تم تم سلطان شاہ کی جلی بیوی ہو؟“ امین کا سکتا آخر کار ٹوٹ گیا۔ فوزیہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

”اگر تم سے شادی کر رکھی ہے تو مجھے لانے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ وہاں ہی ہو کر بولی۔ فوزیہ نے اسے صرف دیکھا تھا کہا کچھ نہیں تھا۔

”وہ شخص فراڈ ہے انتہائی چپ ہے۔ میرا بس چلنے لے ایک پل کی تاخیر کیے بغیر ہاٹ کر دوں۔“ امین کا غصہ تدریجاً بڑھتا جا رہا تھا۔

”سلطان شاہ کو لڑکیوں کی کوئی نہیں ہے امین! تم خوش نصیب ہو کہ انہوں نے.....“

”شٹ اپ۔“ امین نے اس کی بات سے بغیر جھجک دیا۔ ”تم اسے خوش نصیبی کہہ رہی ہو۔ میرے نزدیک یہ بد نصیبی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک کرپٹ انسان سے شادی ہونا خوش نصیبی نہیں ہوتا اور اس پرستم کا بایر ڈھونا۔“ امین نکتے پھلا کر ان کواری ظاہر کر گئی۔ فوزیہ نے کچھ کہنے کی غرض سے منہ کھولا تھا مگر اسامہ کے کمرے کی آواز سن کر چپ ہو گئے۔

”ہوئے تیزی سے اٹھ گئی۔“

”ہیکسیو زنی۔“

”بات سنو۔“ فوزیہ کو دروازے کی جانب لپکتے دیکھ کر امین نے قدرے تیز لہجے میں ان کو مگر فوزیہ سے بغیر تیزی سے نکلی چلی گئی تھی۔

اونٹن کیا اس کے بچے بھی ہیں۔ اس نے اپنا گھومنا ہوا سر تمام کرتی سے سوچا۔ کس چیز کی کی تھی۔ سلطان شاہ کو پھر مجھے کیوں لے آیا۔ بے ہنگامی کا احساس تو بیت آگیز ہوا۔

تھا۔ نظر بظہر بچھٹا۔ ہوا لں کا دکھ پر سے جو کو روک دی لپٹ میں لینے لگا۔

”امی امی ساری۔ میں تمہاری بات نہیں سن سکی۔ دراصل اسامہ رونے لگا تھا۔“ فوزیہ کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا جو بولیہ نشانہ نکلی کھڑی تھی۔

اس کی آنکھوں کا مقصد کچھ کروہ خود پر لپا ہوا لں گئی۔

”اب کیا ہے؟“ شاید اسے بھول چکا تھا۔ فوزیہ اس کی ادھوری بات کا ذکر کر رہی تھی۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں۔“ فوزیہ نے آہستگی سے کہا۔

”اس نہیں کچھ نہیں۔“ امین نے گہرا سانس بھر کر فنی میں گردن ہلائی۔ فوزیہ کچھ دیر اسے ترم آئیز لگا ہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر لپٹ کر جانے لگی پیچھے سے بے اختیار امین نے پکار لیا۔

”سنو کتنے بچے ہیں تمہارے؟“

”اسامہ ایک ہی بیٹا ہے۔“ فوزیہ نے سادگی و بھولپن سے جواب دیا تھا۔ امین سر جھکا کر کوڑ میں رکھے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھنے لگی۔ شاید اپنے وہاں ہونے کا جو اثر ڈھونڈنے کی سعی میں مصروف تھی۔



میرے بابا نے میری امی سے اجازت کے بغیر دوسری شادی کر لی تھی۔ یوں ہی جانے کتنا عمر گزر گیا۔ امی کو بڑی ہی نہ ہو سکی۔ اور زندگی بھی پر سکون گزرتی چلی گئی مگر کتبے ہیں اس طرح کی باتیں زیادہ ہر صدمہ چھپی نہیں رہیں۔ امی کو بھی بابا کی شادی کے متعلق پتہ چل گیا۔ امی کے استفسار پر بابا نے نہ صرف اعتراف کیا بلکہ دھڑلے سے چھوٹی امی کو بھی امی کے سر پر مسلط کر دیا۔ یوں سکون ہمیشہ کے لیے ہمارے گھر سے رخصت ہو گیا۔ گھر میں دنگ سا در پار رہنے لگا۔ میں اکٹھا تھا جبکہ چھوٹی امی سے بابا کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ میری امی بابا کی بے وفائی کا بڑا شرم لپ لپ کر زیادہ ہر صدمہ تک جی نہ سکیں۔ چند روز بیمار کی کے بعد ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان دنوں میں چند سال کا تھا اور میٹرک کے امتحان کے بعد فارغ بھی تھا۔ بابا کی باز میں اپنی پارٹس کی دکان میں تھیں۔ ہمارا شمار خوشحال گھرانوں میں کیا جاتا تھا۔ امی کی جدائی سے کسی کو کوئی خاص فرق نہ پڑا ہوا ہے۔ بابا کو بھی نہیں ان کی بیوی تھی ہی اور ولاد بھی۔ غلاؤ میری زندگی میں آیا تھا۔ میرے پاس ماں تو رہی نہیں بابا بھی کہیں کھ گئے تھے۔ یہ وہی بابا تھے جو کبھی مجھے بے حد چاہتے تھے۔ میرے لاڈ کرتے تھے۔ مگر اب انہیں میں دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ چھوٹی ماں کا رویہ مجھ سے وہی ہی تھا جیسا ایک سوٹی لکڑی کی لڑکی کی ولاد سے ہونا چاہیے۔ انہوں نے بابا کو بھی مجھ سے بدظن کر دیا۔ میرے چھوٹے بہن بھائی مجھے برداشت نہیں کرتے تھے۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا لیکن ماں کو یہ بھی کوارا نہ تھا۔ میری خاموشی میں انہیں گھٹاپا نظر آتا۔ انہیں اس بات پر بھی تاؤ آتا تھا کہ میں پڑھتا کیوں ہوں بابا نے ایک روز کے لیے مجھے دکان پر بٹھایا پھر شاید بھول گئے۔ میرا کانچ چھوٹ گیا۔ جس کا مجھے بے حد رنج تھا۔ ڈنڈ گزرتا گیا اور میں پڑھائی سے کٹ کر دوبار میں غرق ہوتا چلا گیا۔ امی دنوں بابا کے دوست صد اٹکل پاکستان چلے آئے تو بابا سے ملنے دکان پر بھی آئے مگر ان کی بجائے مجھ سے ملاقات ہوئی۔ میرے حالات ان سے پوشیدہ نہ رہے پھر ان کے مشورے پر میں نے اکیڈمی کے قہر و پھر سے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب راتوں کو پڑھنا معمول بن گیا اس طرح میں نے ایم ای اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں صد اٹکل اور ان کی فیملی نے بہت سپورٹ کیا۔ آئی (سزمد) کو میں اپنی امی کی طرح چاہنے لگا۔ وہ بھی بہت اچھی تھیں ان کی بیٹیاں راہیہ معدیہ اور بیٹے علی نے مجھے سگے بھائی کا درجہ دیا۔ مجھے ایک اور چچا لگا تھا جب بابا لچاک حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث ہمیں چھوڑ گئے۔ وہ جیسے بھی تھے میرے سب سے بڑے۔ میں ان کی دکانی جدائی سے بہت کٹھڑ گیا تھا تب بھی انکل کی فیملی نے مجھے سنبھالا۔ بابا کے سوئم کے بعد جب میں دکان پر گیا تو میرے بھائیوں نے بے عزت کر کے مجھے نکال دیا۔ چھوٹی ماں تو پہلے بھی مجھے پسند نہیں کرتی تھیں۔ مگر بابا کے بعد انہوں نے نہ صرف مجھے گھر سے نکالا بلکہ جاہلو سے بھی بے دخل کر دیا۔ صد اٹکل نے مجھے کیس کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے ولت کی ہوس نہیں تھی جب خون کے رشتے مجھے اپنا نہ پر راضی نہ تھے پھر میں جاہلو سے لے کر کیا کرنا۔ یوں میں چپ چاپ الگ ہو گیا۔ خدا کے فضل سے مجھے ایک غیر ملکی فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر جاب مل گئی۔ میں قسمت سے شاکہ نہیں تھا۔ البتہ ذہنی غلبان میں مبتلا تھا لیکن اب اب ایسا بھی کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ تم عمو میرے ساتھ ہو۔ مراد جو اب سے کسی مادیدہ فٹیلے پر نظریں جمائے اسے اپنے زخم دکھا رہا تھا ایک دم موڈ بدل کر بولا۔

”درخرف تم میری آس ہو۔ میری منزل جاتی ہو۔ میں نے جو خاکہ اپنی شریک حیات کا ذہن میں تراشا تھا تم ہو۔ یہو ویسی ہو۔“ درخرف مسکرا دی پھر جیسے کچھ یاد آنے پر چپکتے ہوئے بولی۔

”مراد! ہم فنی مون کے لیے کہاں جا رہے ہیں۔“ اس کے شانے سر جھٹکتے ہوئے اس نے مومنوں بدل دیا۔ مراد چند دنوں کو بالکل خاموش رہ گیا۔ اس وقت درخرف کے منہ سے عہد وفا کی تہمت اور دھڑا کھٹے سبے تل کر خوشیاں انجوائے کرنے اور دل کو چھو لینے والی سہانے مستقبل کی بات سننا چاہتا تھا۔

”کیا بات ہے جان بھف! چپ کیوں ہو؟ کیا تم مجھے فنی مون پر نہیں لے جاؤ گے؟“ وہ بہت شاعر تھی۔ زمانے کے رنگ دیکھتے تھے۔ فلموں ٹائٹل سنواریوں سے بہت حد تک سیکھ چکی تھی۔ جاتی تھی بات منوانے کے کون سے تیر بہف طریقے اپنا لے جاتے ہیں۔ سو اس کے نزدیک ہوتے ہوئے شرٹ کے ہٹنوں سے کھیلتے ہوئے دل گداز لہجے میں کہا۔ مراد خالی خالی نظروں سے اسے سگے لگا، سب کچھ اس سے شیر کرنے کے باوجود درخرف کو یہ نہ بتایا تھا اپنی شریک زندگی کے متعلق اس کی کیا خواہش تھی۔ ایک مکمل مشرقی لوگوں سے آراستہ نازک لڑکی جو اس کی گرم کچھ ہوں پر موم کی طرح لچکلی جائے۔ اس کی شرٹ پر چھوٹی موٹی بن جانے والی اس کی والنگ پٹ خود ہی سمٹ جائے اس کے لمس پر حسد کی مانند ہک اٹھے اس کی شدتوں پر گہرا کر کھڑ جائے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس سے کرے تو جھٹکے ”شرمائے“ اس کا نام لے تو کال دیبا کی سرخیوں سے دھک اٹھیں لگا ہیں جھک جائیں۔ ٹیکس بار دیا سے اٹھنے سے انکاری ہو جائیں۔ درخرف حسن میں تو کم نہ تھی مگر باقی کسی معیار پر پوری نہ تڑپائی۔ خوب صورتی کی تو مراد احمد نے کبھی چاہ نہیں کی تھی۔ وہ خود سیدھا سادا سا تھا اسے تو اپنی بے انتہا پیرس کر دینے والی شخصیت کے متعلق صحیح طور آگاہی نہیں تھی۔ اس نے تو اپنے ہر جذبے ہر احساس اور محبت و خلوص کو اپنی شریک حیات کے لیے بہت سیرت کر رکھا تھا۔ وہ دل بھٹک گیا چھوڑا انو جو انہیں نہیں تھا۔ مگر اب وہ اندر سے جیسے بجھ کر رہ گیا۔ درخرف محبت کے اظہار اور عمل میں اس کی سوچ سے کہیں بڑھ کر بے باک ثابت ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک سو کواری ہی درائی تھی۔ کبھی کبھی وہ اسی یا سیت میں گھر کر رہ جاتا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا

تھا۔ درخف کی اکثر باتیں اسے ناکواری کا احساس دلاتی تھیں۔ اسے شک کا دیا کرتیں مگر اس کے باوجود احمد اسے چاہنے لگا تھا۔ محبت کرنے لگا تھا۔ اپنی نظریات کے مطابق بے غرض بے ریا محبت۔ درخف ایک خوب صورت ساحرہ تھی۔ حسین جاوگرتی تھی جو اسے اپنے سحر میں جکڑ چکی تھی۔ ایک حسین بات تھی۔ منتر پڑھ کر اسے اپنا سیر کر رہی تھی۔ اور پھر بھی وہ خوش تھا۔ بے حد خوش۔

”مرا دیا کیا ہوا؟ تمہیں کہاں کھو گئے؟“ درخف نے اس کی پیشانی کے بال مٹیوں میں جکڑ کر جھٹک دیا تھا۔

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم؟“ اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بے خیالی میں اسے دیکھا۔

”جی میں کہہ رہی تھی۔“ غی غی کے لیے کہاں جائیں۔ میں نے جیلا بار تو تم سے کچھ مانگا ہے۔“ وہ اسے ٹھٹک کر فرمائش کرنے لگی۔ مراؤس دیا۔

”اور میں انکار نہیں کروں گا“ ضرور جائیں گے۔“ اس نے محبت کی ہر درخف کی پیشانی پر شیت کرتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

”مگر کہاں؟“ درخف نے بن کر پوچھا۔

”جہاں تم کہو۔ لب خوش۔“ مراؤس نے اس کے بال کھیرے۔

”اوہ قینک یوڈا رنگ۔“ درخف نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔



نوزیرہ امین کے ساتھ ہی وہی لاڈلہ میں بیٹھی تھی۔ اسامہ کاربٹ پر بکھرے کھلونوں میں گن گن تھا۔ دروازے پہ سلطان شاہ کواد رہا۔ نوزیرہ اسے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھ کر قریب آگئی۔ بریف کس اس کے ہاتھ سے لے کر سبز پہ رکھا۔ بھڑکوت اتارنے کو ہاتھڑی علیا ہی تھا۔ بھی سلطان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”تم سب بچے دو کر رہی تھیں بہت عرصے سے۔ اچھا بھلا جیسا بھی کر لیا۔ اب اسے کرنے دو۔“ اس کا اشارہ ہونے پر بیٹھی امین کی جانب تھا۔

”اشھوم۔“ اس کے پر غوت لہجے میں حکم تو غر کا واضح منظر موجود تھا۔ امین قطعی نہ سمجھ پائی۔ وہ بیٹھی الجھن آمیز نگاہوں سے دونوں کو دیکھتی رہی جبکہ نوزیرہ اس کی تاخیر پر سخت متوشل نظر آنے لگی۔

”بنا دلو اسے میں ایک بات کو صرف ایک بار کہنے کا عادی ہوں۔ جو نہیں سمجھتا اس کی کم لہلی پر ترس کھانے کے بجائے صرف سزا دیا کرتا ہوں۔“ وہ کوپا بھڑکا رہا تھا۔ نوزیرہ کی آنکھوں سے واضح خوف و سراسیمگی چھلکنے لگی۔ خائف تو امین بھی ہوتی تھی مگر نوزیرہ نے بڑھتی۔ موصوف کس بات پر گرجا کر رہے ہیں۔

”امین ان کا کوٹ اتار دو پلیر۔“ نوزیرہ اس کے پاس آ کر گھگھکیا تے ہوئے کچھ اس قدر جابجاست سے بولی تھی کہ امین بھی گڑبڑا کر فوراً اٹھ گئی اور تاتا چہرہ لیے اکھڑے ہوئے سلطان شاہ کے قریب جا کر کوٹ اتار دیا۔ محض اتنی سی بات پر اتنا تھکے دل ہی دل میں بیٹھی آتی تھی تو دوسری جانب خود پہ حیرت ہو رہی تھی۔ اس طرح تو وہ کبھی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ اس سلطان شاہ میں ایسا کیا تھا کہ اس کے سامنے آنے پر ہی ہاتھوں پاؤں میں لرزش آتی تھی و جو وہ میں سنا سنا ہی ہوئے لگتی تھی۔ دل حلق میں ایک جانا کوٹ اتارتے ہوئے بھی اس کے ذہن کے کسی کو نے میں یہ خوف پوشیدہ تھا کہیں سلطان شاہ غصے میں اس پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ تبھی تیزی سے دوڑتے ہوئے کوٹ کو صونے پر ڈال کر وہاں سے بھاگ جا چاہتی تھی کیونکہ اس نے مزید ترساں کر دیا۔

”نہیں امین! پلیز کوٹ کو ہینک کرو۔“ کورا امین جو کہ کوٹ تقریباً صونے پر ڈال ہی چکی تھی پٹن کر دو بارہ جھپٹ کر سینے سے لگایا۔

”پھر پھر کیا کروں؟“ سب سے ہوئے انداز میں اس نے نوزیرہ کو مخاطب کیا۔ نوزیرہ اگر خود بھی سلطان شاہ کی موجودگی کے باعث حواس نہ چھوڑے ہوئی تو یقیناً اس کی گھبرائی ہوئی صورت پر ضرور ترس کھاتی۔

”اسے ہینک کرو۔“ نوزیرہ نے سلطان شاہ کی سمت چورنگ ڈال کر آہستگی سے جواب دیا۔

”اوہ اچھا۔“ امین نے سر ہلایا تھا اور کوٹ لیے تیزی سے چلی گئی مگر وہ اب جو کراؤ اس چٹائی و جو سے ہو گیا۔ امین کا سر بہت بری طرح اس کے شانے سے ٹکرایا تھا۔ آنکھوں تلے اندیر سے چھا گئے۔ ایک لمحے کے لیے کچھ نظر نہیں آیا سلطان شاہ ایک تہہ بھری نگاہ اس پر ڈال کر پلٹ کے باہر گیا اب اس نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔



مرکوز درخف کو لے کر پہلے اسلام آباد آیا تھا وہاں ایک دن قیام کے دوران امام بری کے دربار پر حاضری دینے کے بعد وہ لوگ مری کے لیے روانہ ہو گئے۔

”تمہیں پتہ ہے درخف میں نے وہاں کیا کیا مانگا؟“ دوران سفر وہ کھڑکی کے رستے جاہر دیکھتے میں توتھی۔ مراؤس نے اس کی سوچوں کے ارتکا کو ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تم بتاؤ۔“ درخف اس کا اشتیاق دیکھتے ہوئے پوچھے بغیر بندہ نہ کی۔

”مجھے کچھ بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہمارے بہت سارے بچے ہوں۔“ درخف نے اس کو جیہہ چہرے پر اٹھائی چمک دکھی تو منہ بسور لیا۔

”یہ کیا بات کر رہے ہو اور ادا میں اتنی جلدی بچے کتنی میں نہیں ہوں۔ میرا فکر خراب ہو جائے گا۔“ مراؤس بھڑکا تھا پھر اسے انور دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا میری خواہش کا بھی احترام نہیں کروں گی؟“ درخف کا جی جا ہاتھ اب سے جواب دے ڈالے مگر مصیحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موضوع بدل ڈالا۔

”مرا دیا تم نصیحتی لگی بھی جائیں گے۔ پتہ ہے میں کبھی وہاں نہیں گئی۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔“ مراؤس خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس بھر کے آنکھیں موندتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر نکال دیا۔ درخف نے اگرچہ اس کی فنگی آنکھوں کا کیا تھا مگر اس وقت وہ کوئی بھی پیش رفت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس موقع پر ڈٹے رہنے کے لیے اسی طرح کی بے نیازی رہنمائی۔ اس کے کندھے کے برعکس مراؤس کا موڈ زیادہ دیر تک خراب نہیں رہا۔ کچھ دیر بعد ہی سب کچھ بھول بھال کر وہ سابقہ انداز میں چٹکنے لگا تھا۔ اس کے منہ سے فطری بات کو مروا نے پورا کیا۔ خون نش کا احترام کیا تھا۔ مری کے علاوہ نصیحتی کی بویہ کے علاوہ اسے کواغان اور سوات کی سیر کے لیے بھی لے گیا تھا۔ درخف بے حد خوش تھی۔ مراؤس کی محبت کے احساس نے اسے مزید نکھار بخش دیا۔ وہ غنوی بعد جب واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تب بھی مراؤس نے اسے ڈھیروں کے حساب سے دل کھل کر شاینگ کروائی تھی،

”مرا دیا! اُس اُس کریم۔“ درخف اُس کریم بارو کی طرح لگی تھی۔ مراؤس وہیں ٹھہرا کر خود اُس کریم لینے چلا گیا تب درخف کی نگاہ خود سے کچھ فاصلے پر کھڑے اپنی سمت کھتے اس ڈشنگ سے لڑکے کے جا ملی تھی جو بے حد شغ و شگ ساتھ نظر کے اس تصادم پر اس نے فوراً ایک آنکھ داب کر منہ میں کچھ کیا تھا۔ درخف بجائے برامنانے کے فس پڑی جس سے اس سمت بھینا حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ اب وہ نہ صرف قریب آکھڑا ہوا بلکہ کچھ لنگھانے بھی لگا تھا درخف اس سے باتوں میں لگ گئی۔ تب ہی مراؤس اُس کریم لیے چلا آیا۔ درخف کے پاس کسی انجان لڑکے کو کھڑے دیکھ کر اس کی متنی پیشانی پر ناکواری کے بل پڑے تھے۔ مزید غضب درخف کو اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پختے دیکھ کر ہو مروا نے اُس کریم مارے طیش کے وہیں پھینک دی اور پاؤں پختے ہوئے اس کے پاس آیا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ اس کا لہجہ بھیچا ہوا اور مشتعل تھا۔ درخف چونک گئی۔ مراؤس کے کڑے تیر غضبناک حد تک بڑھ چکے تھے جیسی وہ گھبراہٹ لگی۔

”چلو آؤ۔“ مراؤس نے آتش نگاہ اس لڑکے پر ڈال کر غصے سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے ساتھ لے گیا تھا۔



امین وسیع و عریض لان میں گھاس کے سبز ٹھیکس فرش پہ مضطربانہ دوسرے لایر ٹیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بایست کے گہرے ہوتے رنگ واضح محسوس کیے جاسکتے تھے۔ ایک ایک اولے ذہنی غلط فہمائیاں تھا۔ ملتے ملتے وہلا دور جکڑ گئی تھی اور اب بے مقصد لان کے پتھوں بیچ بنے سنگ مرمر کے فوارے سے پھونکی پانی کی دھاروں کو دیکھنے لگی۔ کبھی سوئنگ پول کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جھلماؤی ہوئی روشنیوں کو اس کا ذہن بے حد منتشر تھا۔ اس گھر میں آکر اسے حیرت کے اتنے بڑے بڑے جھٹکے تھے کہ لفظ حیرت بہت چھوٹا اور معمولی لگنے لگا تھا۔ سلطان شاہ کے وسیع و عریض گھر میں چار بیڈروم تھے جن میں سے تین فرسٹ فلوور پر تھے اور تینوں ہی زیر استعمال تھے ایک بیڈروم میں نوزیرہ اسامہ کے ساتھ تھی۔ دوسرا امین کے حصے میں آیا۔ تیسرا اور سب سے وسیع شاندار بیڈروم سلطان شاہ کا تھا۔ وہ شخص اس قدر مغرور تھا کہ خود چل کر ان کے پاس نہیں آتا تھا۔ وہ دونوں میں سے جس کی ضرورت ہوئی اسے بولالیتا۔ جس بیڈروم میں شادی کی رات امین کو لایا گیا تھا وہ سلطان شاہ کی ہی ملکیت تھا۔ شادی کے تیسرے دن اس دروازے پر غیظ نے امین سے کہا تھا۔

”تم جاؤ اور اسے بھیج دو۔“ پہلے تو وہ سمجھ نہ کی تھی۔ خیال تھا اسے کوئی کام ہوگا نوزیرہ سے جیسی وہ ایمان ندیا مگر جب رات کو سونے کی غرض سے وہاں آئی تو دروازہ کھولتے ہی دلیلیز پر سناکت ہو گئی جو منظر اس کی سناکت ہوتی نگاہوں نے دیکھا تھا وہ شاید نہیں دیکھنا چاہے تھا۔ آہٹ پر ہی سلطان شاہ کے ساتھ نوزیرہ بھی متوجہ ہوئی تھی۔ اسے یوں دروازے کے دو دیانہ بت بنے دیکھ کر سلطان شاہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ آنکھوں سے کوپا شرارے نکل کر امین کے جوہر کو بھسم کرنے لگے۔ گلاب ہی وہ جھرجھری ہی لے کر جیسے ہوش کی دنیاسی اوٹی تھی۔ اس سے پہلے کہ پلٹ کر بھاگ جاتی قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔

”کیا کر رہی ہو یہاں؟“ وہ کوپا قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تھا۔ امین کی پھلکی ہوئی کشادہ آنکھوں میں غایت درجے کا ہم ٹھانڈا اس میں شک نہیں تھا وہ سلطان شاہ سے خائف رہا کرتی تھی۔

”ناؤگٹ لاسٹ۔“ وہ غر لیا اس قدر شدید اسلمٹ پر امین کا چہرہ دوڑھواں دھواں ہوا تھا۔

”زندہ ہو یا مر گئی ہو۔“ اس کا بازو لاڈی گرفت میں جکڑ کر زوردار جھٹکا دیتے ہوئے وہ کوپا دھاڑا تھا۔ امین بری طرح لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی پھر ایک پل کی بھی تاخیر کے بنا منہ پر ہاتھ رکھ دیکھ دیکھتا ہوا وہاں سے چلی آتی تھی۔ تمام شب ستر پر کر ویش بدلتے ہوئے اس کا دماغ سنگین رہا تھا۔ ایک ہی منظر بار بار انکھوں میں روشن ہو کر بے تدری وحشت میں اضافے کا سبب بنا رہا یہ سوچیں ہی تھیں کہ سر در سے پھٹنے لگا تھا۔ فارگیت اس نے کر ویش بدلتے ہوئے سوچا مگر ذہنی پیچان کی طور پر کم نہ ہوا تب شدید بے بسی محسوس کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ایسا کیوں ہو رہا ہے نوزیرہ بھی اس کی بیوی ہے۔“ اس نے جیسے خود کو پر سکون کرنا چاہا۔ ”نوزیرہ نے میری جگہ نہیں لی بلکہ میں نے اس کا شوہر تقسیم کیا ہے۔ چاہے جیسے بھی حالات تھے۔“ اس کی کاڈر رنگ نیل کے آئینے سے دکھائی دینے لپسے ٹکس پر جائزہ لیا۔ اس وقت وحشت و اضطراب اور بے چینی سے وہ بے بسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

”کیا ہو مجھے یہ میں ہوں۔“ اس نے خمیر ہو کر سوچا اور اپنا چہرہ چھو اٹھا کیا یہ بڑا ہے۔ رقابت کا زور اور احساس حسد کی کوئی تمہت وائے اس نے ازخود اپنے سے خود سے

سوال کیا تو کیا وہ اس سلطان شاہ جیسے حکم چڑھے بدو مانگ بندے سے۔ نوہ۔ اس کا سر بے ساختہ چکر اگیا۔ مارے اضطراب کے وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ وہ غرور شخص جو اپنے کو کسی دوسرے کو قائل و دروغ افشا نہیں جانتا تھا اس سے محبت کر بیٹھی ہے۔ یہ خیال بھی سوبان روح تھا۔ دھڑکے بھی ایسا نہیں چاہ سکتی تھی۔ وہ ہر رات ایسا ہی اضطراب اپنے نصیب میں اکٹھا نہیں چاہتی تھی مگر ان تھی نہیں جانتی تھی کہ محبت کی انہیں جانی جاتی ہو جا رہی ہے۔ یہ سچ تھا اسے سلطان شاہ سے محبت ہوئی تھی اور وہ تھی کہ مسلسل لی کیے جا رہی تھی۔ جی تو یہ اضطراب بڑھے جا رہا تھا اور اسے خبر تک نہ تھی یہ کس کے کارن ہے۔



ان کی واپسی پر ہی اٹکل صدر نے انہیں اپنے ہاں ڈزپر انوائٹ کر لیا۔ مرنج آفس جاتے ہوئے اسے بتا کر گیا تھا تا کہ اس کی واپسی تک تیاری کر رکھے مرنج ایشام میں گھر آیا تو درجنف بھڑکیے لباس میں بیٹانی سے اس کی سختی تھی۔ ڈارک سیک اپ کو رجید تر آش خراش کے لباس نے بلاشبہ اس کے حسن کو دوا اٹھ کر دیا تھا مرنج کو جس بات پہ اعتراض ہو تھا وہ اس کی سلیو بس شرٹ تھی۔ مگر کچھ کہے بناب سمجھ کر وہ گیا۔ گھر کی خراب حالت خچ خچ کر درجنف کے پھوڑ پین کا اٹھار کر رہی تھی۔ مرنج نے یہ سب کچھ بھی دیکھا تھا مگر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ نجف کام سے جی چلتی تھی۔ شادی کے بعد سے تقریباً دو ہزار سے کھانا لاتا تھا۔

”مرانم تہا لو میں نے تمہارے کپڑے پر پس کر دیے ہیں۔“ اس کی جھکن بے زاری و بھوک سے بے نیاز درجنف کے اعصاب پر گھر سے نکلنے کی جلدی سوار تھی۔ مرنج کا جی چاہا تھا اسے بری طرح سے جھڑک دے اسے جھنجھوڑ کر بتلائے کہ نصف کس بات پر آ رہا ہے۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ کچھ بھی کہہ نہ پاتا۔ شاید محبت کرنے والوں کا لی ہی بے بسی نصیب ٹھہرتی ہوگی۔ اسے بھی تو درجنف سے محبت تھی کیسے اس کا دل توڑتا۔ کس دل سے ڈانٹا درجنف نے جو اس کی شدہ ٹلو کو سوٹ اس کے حوالے کیا تھا اس کی ٹیکٹیں بھی دور نہ ہوئی تھیں۔ مگر تمام کرواں روم میں جانے کے بجائے وہ خود روم کی سمت بڑھ گیا۔ مگر بڑ پر اچھال کر اس نے دوسرا سوٹ نکال کر خود کو آس روم میں بند کر لیا۔ وہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا درجنف عام لڑکیوں سے اس قدر اگلی کیوں ہے۔ تیار ہونے میں اسے زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔

”تم ایسے ہی چل رہی ہو؟“ رست و آج گاٹی پر باندھتے ہوئے اس نے درجنف کو مخاطب کیا۔

”ہاں کیا اچھی نہیں لگ رہی؟“ وہ اٹھلائی تھی۔

”ہم ایک پر جا رہیں گے۔ تم بڑی چادر کوڑھ لو۔ دوپٹہ بہت باریک ہے اور تمہاری شرٹ بھی سلیو بس ہے۔“ شاید اس سے زیادہ مضطرب کیا رہا تھا۔ جی تو وہ غری و رسانی سے اسے سوک گیا جبکہ درجنف کے تپور بڑھنے میں دیر نہیں لگی۔

”بائیک پر جا رہے ہیں۔ دوپٹہ باریک ہے سلیو بس شرٹ۔ مرانم اتنے قد مات پسند ہو گئے۔ میں نے تصور تک نہیں کیا تھا بجائے میری تحریف کرنے کے تم نصیحتوں کا پنڈر اٹھ گول کر بیٹھ جاتے ہو تم جلتے ہو اس بات سے کہ ہر گنا کچھ پہ ٹھہرتی ہے۔ ہر کوئی مجھے ستائش مہری نظروں سے کیوں دیکھتا ہے۔“ وہ جاہلوں کی طرح خچ خچ کر جھگڑتے ہوئے بولی۔ مرنج حیرت سے اس کا یہ بیاروپ دیکھ رہا تھا۔



سلطان شاہ کا طرز عمل ایمن کو سر امراہی انسلٹ محسوس ہوتی تھی۔ یوں بھی اس کے اندر جو جنگ جھڑپکتی تھی اس نے اسے بری طرح سے چڑھ کر دیا تھا۔ وہ ابھی تک انٹھی ہوئی تھی۔ کسی طور مانے کو تیار نہ تھی کہ وہ سلطان شاہ کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ یہ اس کی محبت کی نفی کی کوشش تھی۔ جی تو اس نے خود سے عہد کر لیا تھا۔ سلطان شاہ سے نہ ڈرنے کا اس کی بات نہ ماننے کا میں تمہیں بتاؤں گی سر شاہ کو عورت پاؤں کی جوتی نہیں ہے۔ نہ ہی راستے میں پڑا ہے یا پھر جسے تم قدموں کی ٹھوکریوں پر رکھو تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔ وہ ٹوڑی غور تھیں جوتہاری بے دام غلام بن گئیں۔ اب کے تمہارا واسطہ ایمن ملک سے پڑا ہے۔ وہ جیسے سوچ رہی تھی، ذہنی کھلان بڑھ رہی تھی۔ اس نے جانا تھا سلطان شاہ نے کبھی اس کا نام نہیں لیا۔ ہمیشہ ہی تحفہ آمیز انداز میں تو یہ تم کہا کرتا اگر فوزیہ سے اس کے متعلق بات کرتا تو منہ گاڑ کر اس سے کہہ دیتا اور آج تک اتنی ذلت اس قدر نظر انداز کی کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ جس قدر اہانت آمیز سلوک سلطان شاہ اس سے روا رکھے تھا۔ ذرا سامنے غور کرنے پر یہ حقیقت بھی کل کر سامنے آگئی ایسا رہ یہ صرف اس کے ساتھ ہی نہیں تھا فوزیہ کے لیے بھی انداز مختلف ہر گز نہ تھا۔ وہ بھی تو ”تم اس“ تھی۔ حالانکہ وہ تو یہ چاہے تھا یہ جان کر اسے صبر آ جاتا مگر ایمن ملک تو مزید بھڑک اٹھی تھی۔ جب ہی اس نے قطعی فیصلہ کر لیا۔ اس پتھر میں چونک لگائے گی۔ برف پگھلا ڈالے گی۔ وہ خول ڈوڑے گی جو سلطان شاہ خود پر چڑھائے ہوئے ہے۔ اسے تو یہ خول ہی لگے تھے۔ سلطان شاہ کو چونکا گئی جو سب کو چونکا جاتا ہے۔ اسے حیران کر گئی جو سب کو حیران کرتا ہے۔ اسے دکھ گئی جو سب کو دکھاتا ہے۔ جب خود سے ارادہ پختہ کر لیا تو فوزیہ کو بھی اس ہم میں شامل کرنا چاہا جو بھی تھا یہ کام آسان ہر گز نہ تھا مگر فوزیہ اس کے عزائم سن کر پسینہ بھینکی بی پھر خود وہ پورا آخر میں جب ایمن کوڑے لے دیکھا تو غصے میں آگئی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو ایمن۔“ فوزیہ نے ڈانٹا تھا۔

”تم یہ بتاؤ میرا ساتھ دو گی یا نہیں؟“ ایمن نے دو ٹوک انداز بتایا۔

”دیکھو ایمن! تمہیں خود پسند نہیں ہے کہ تم کس قدر غلط بات کر رہی ہو جو بے حسیا ہے قبول کر لینے میں ہی تمہاری عافیت ہے ہم دونوں نے ایک دوسرے سے رفاقت محسوس نہیں کی کیا یہ اچھی بات نہیں۔ پھر تم کیوں یہ دوسرے رہی ہو۔“

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔ ہاں یا نہیں۔“ ایمن جوشان چکی تھی اس سے انج بھر بھی کسے کو تیار نہ تھی۔ فوزیہ کے سمجھانے پر رکھائی سے بولی فوزیہ نے ایک اور کوشش کے طور پر اسے سلطان شاہ کے دربار سے دیے اسے بتایا کہ سلطان شاہ غصے کا کتنا خیز ہے۔ مگر وہ ایمن ہی کیا جو کسی بات کی ٹھان لے پھر ارادہ بدلے اسے پس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر فوزیہ نے صاف انکار کر دیا۔

”سوری۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔“ ایمن نے لاپرواہی سے شانے جھٹکے تھے۔

”آئی ڈیفنڈ کیرمب میں وہی کروں گی اور دیکھنا تمہارے شاہ صاحب کو کیسے زچ کرتی ہوں۔“ ایمن کے خطرناک عزائم کو فتح کر فوزیہ منت مانت پر اتر آئی۔

”پلیز ایمن! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ دیکھو میری بات مان لو۔“ ایمن یوں ٹپٹی رہی جیسے یہ سب کچھ اس سے نہیں کسی اور سے کہا جا رہا ہو۔ فوزیہ کچھ دیر تک بے بسی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے شستہ ہوئی بولی تھی۔

”کیوں چاہتی ہو ایسا؟ کیا تمہیں ان سے محبت نہیں ہے؟“ ایمن کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا اس نے خود سے گناہ چراتے ہوئے فوزیہ کو کھانچا جانے والی نظروں سے گھورا۔ فوزیہ دھیان دیے بنا بولے گی۔

”میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی جانتی ہو کیوں کیونکہ مجھے ان سے بے حد محبت ہے اور وہ ابھی ہے کہ میں انہیں دکھ نہ دوں۔ لیکن ایمن تمہیں میں منع اس لیے کر رہی ہوں سلطان شاہ کے ساتھ میں کچھلے پانچ سالوں سے ہوں کہیں آج تک ذرا سا بھی نہیں سمجھ پائی۔ وہاں جمل شکست ہیں۔ لہذا اب بھی میرا اخصانہ مشورہ یہی ہے۔ یہ خیال دل نے نکال دو ورنہ اس لگاؤ سے جو نقصان تمہارا ہو گا وہ مجھے دکھ ہی کرتا رہے گا۔“ اپنی بات ختم کر کے فوزیہ اٹھی تو ایمن نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

”تم جانتی ہو ہمارے درمیان کیا شہ ہے؟“ فوزیہ گہرا سانس کھینچ کر گناہ کا زور بدلی گئی۔

”آجکلیں صحت چر او فوزیہ! یہ سچ ہے ہمارے درمیان جو رشتہ ہے وہاں رفاقت اور حسد کی بہت گنجائش نکلتی ہے۔ پھر بھی میرے لیے پریشان ہو۔“ فوزیہ مسکرائی۔

”ہاں اس لیے کہ ہمارے درمیان کڑی سلطان شاہ ہیں۔ جن سے محبت کی جانی ہے ان سے وابستہ لوگوں سے اور چیزوں سے محبت کرنا نہیں پڑتی از خود ہو جاتی ہے۔“ فوزیہ کی بات پر ایمن چند ثانیوں کو ٹنگ رہ گئی تو کیا وہ بھی۔ اس کے دل کو کچھ وا تھا۔ یہ شخص آخر کیا چیز تھا۔ کیوں ہو رہی تھی ہر کسی کو اس جیسے بندے سے محبت جانے کیوں اس کا دل روٹھا۔ جانے محبت کی بے بسی پر یا اس جذبے کی بے قدری پر۔

”مجھے یہ بات بہت ہرٹ کرتی ہے کہ اس شخص نے میرے ساتھ ظلم کیوں کیا۔ کیا گاڑا تھا میں نے اس کا۔ مجھے نہیں پیتھا وہ میرا ہے۔ ایک بچے کا باپ ہے۔ لیکن اگر پتہ چل بھی جاتا تب میں کیا کر سکتی۔“ ایمن اپنے ہاتھوں کو گھورتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”جانتی ہو فوزیہ! جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو بھی کبھی تھی کہ سلطان شاہ کو شاید تم سے لڑاؤ کی خوشی نہیں ملی۔ مگر اسلحہ کے متعلق جان کر یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ وہ جو کھیلتا ہے۔“

”پلیز ایمن! انہیں یہ طرز خطاب پسند نہیں اور جو ان کو قیامت آجائے گی۔“ فوزیہ نے یوں گہرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ جیسے سلطان شاہ کچھ آس پاس ہوا۔ ایمن نظر سے مسکرائی۔

”موصوف جوں پے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں پر کیوں زبردستی ڈھنستے ہیں۔ جانتی ہو تم وہاں سے نام تک لیا کورا نہیں کرتا۔ یہ تم اس کیا ہے یہ تمہیں نہیں لگتا یہ ہماری تو ہیں بے حد میل ہے۔“ اس پہ وہی بھجان چھانے لگا سیریک ہو کر چچی تو فوزیہ غور و نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے وہ شخص ذہنی مریض ہے۔ بہت پست ہے اس کی سوچ۔ تم اگر میرا ساتھ نہیں بھی دو گی تا تو مجھے رتی پر برفرق نہیں پڑتا۔ میں نے سوچ لیا ہے سلطان شاہ کو یہ شاک ضرور لگاؤں گی۔“ اس نے سر ہلچے میں کہا اور جھٹکے سے اٹھ کر چلی گئی۔



آفس سے واپسی پر مرنج کو پورا دوست مل گیا کالج کے زمانے میں اس کی آزر سے گہری دوستی تھی۔ آزر بھی مرنج کو کچھ کر کھل اٹھا۔ بہت چاہت سے گلے ملا اور کہیں بٹھ کر چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔

”گھر چلو ہیں چائے پلواتا ہوں۔“ مرانم نے کہا تو آزر مسکرایا تھا۔ راستے بھر مرنج اس سے بہت سی باتیں کرتا رہا۔

”بھائی کسی ہیں؟“ آزر نے اس کے منہ درجنف کا نام سن کر استعق سے پوچھا۔

”لو اوروں کا پار۔“ مرنج نے دل دوا دوا راصل درجنف کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آزر کو گھر لے کر جانے کی آرزو تو کر رہی تھی۔ مگر اب یہ سوچ کر پریشان تھا جانے نجف نے گھر بھی صاف کیا تھا نہیں البتہ مرنج نے بھاری بھاری کی کہہ رستے میں ہٹلے سے کھانا پیک کر دیا تھا۔ نجف نہ بھی بناتی تو وہ خود بنا سکتا تھا۔

”کیا بات ہے یا رہائی گھر پر نہیں؟“ آزر نے اس کی اس حرکت کو اچھے سے دیکھا تھا۔

”نہیں یا دروہ دراصل درخشف کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔“ درخشف کی طبیعت کے متعلق جو اس نے جھوٹ بولا تھا یہ ”مصلحت کا تقاضا تھا کہ کچھ بھی تو کہنے والا نہ تھا۔ مرو نے زندگی بہت صاف ستھری اور ہموار سیر کی تھی جس میں اس طرح کی لغزش نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس وقت بھی غلط بیانی سے کام لینے کے باعث دل پہ بوجھ سا آ رہا تھا۔ جس وقت اس نے دروازے کے پاس بائیک روک کر دھنک کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے ہی دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ مراد کی پریشانی نظری تھی۔ بائیک وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے اندر چلا آیا۔

”درخشف درخشف۔“ اس نے آہستگی سے پکارا مگر جواب نہ ملا تھا۔ وہ آگے بڑھ آیا۔ بیڈروم سے تیز تیز بولنے کی آواز بارہن تک آ رہی تھی۔ اس کے قدم میکا کی انداز میں اسی سمت بڑھنے لگے۔

”ہاں مجھے اعتراض ہے، سناتی ہوں کہ تم میری پہلی محبت ہو مگر اب میں مجبور ہوں تم چھوڑنا۔ میں شادی شدہ ہوں تو تم سے اس بل بھی نہیں سکتی۔ وہ جیسا بھی ہے ہر اشوہر ہے اگرچہ اس نے میری زندگی مجھ پر تنک کر رکھی ہے۔ مانتا ہوتا ہے۔ شکی مزاج غلطی ہے مگر کیا کروں نبھاتا ہوں۔“ مراد کا پورا بوجھ سناٹوں کی زد پر آ گیا چہرے کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑ گئی۔ آزر جو اس کے ساتھ ہی وہاں تک پہنچا تھا، ہوق سا کھڑا ہو کر لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مراد کی ساکت نگاہوں نے آزر کے دونوں پر لڑائی طعنیہ مسکراہٹ کو محسوس کیا تو جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ شدید اشتعال کی لہر اس کے اندر سے اٹھی تھیں قدم بڑھاتے ہوئے وہ ایک دم ہی دروازہ کھل کر اندر گھس آیا۔ ڈریننگ روم کے آئینے کے سامنے کھڑی درخشف ایک لنگٹ کا شوق پورا کر رہی تھی اور اس قدر گن گنی کہ مرو اس کے آنے کی بھی خبر نہ ہو پائی جبکہ مراد جو غیض و غضب کی حالت میں اندر آیا تھا۔ اب ششدر سا اس کا یہ بیاروپ ملاحظہ کر رہا تھا۔ سچی اچانک درخشف بولتے ہوئے مڑی اور مرو کو اپنے سامنے پا کر ٹھٹھک گئی۔

”اوہم ادا تم کب آئے ہو؟“ چند منٹوں کو خفیف سی کھسیاہٹ میں مبتلا ہو کر وہ اگلے ہی لمحے بائیل نظر آنے لگی۔ مراد تو اس کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی اس اضافی خوبی پہ چکر لیا ہوا تھا۔ بھلا کیا جواب دینا۔

”مرو کیا ہو اور یہ کون ہیں؟“ درخشف نے پہلے اس کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑا تھا پھر آزر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی تب مراد کو گہرا سانس کھینچ کر سر جھٹکنے لگا۔

”یہ آزر ہے میرا دوست آؤ آزر درخشف روم میں چلے ہیں۔“ مرو نے آنکھیں پھاڑے کھڑے آزر کا ہاتھ تھام کر کہا اور باہر نکل گیا۔



”تم اپنے گھر چلی جا، مگر اسامہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ خادم حسین تمہیں ڈراپ کر دے گا۔“ صبح آفس جانے سے قبل سلطان شاہ نے امین کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نوزید کو مخاطب کر کے روکے پیچھے انداز میں حکم دیا تھا۔ ”یہ آزر امین نے بھی سنا تھا تب سے اس کی جان پر بن آئی تھی۔ سچی و نوزید کے سر پر سوار ہو گئی۔

”سنوٹ جاؤ۔“ اس نے کیا منت کی تھی نوزید نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دائمی حالت پر شبہ ہو۔

”مجھے تمہارے اس عطر سے ڈر لگتا ہے۔“ دل کا چور زبان پڑا گیا مگر نوزید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا سچی بات بدل گئی۔

”سلطان شاہ نے ایسا کیوں کہا ہے؟“

”پتہ نہیں وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔“ نوزید بیگ میں صرف تھی۔ سرسری سالے دیکھ کر جواب دیا۔

”کیا سلطان شاہ نے تمہیں اس سے پہلے بھی اس طرح بھیجا ہے؟“

”نہیں۔“ نوزید اب سوٹ کیس بند کر رہی تھی۔ مختصر جواب دیا۔

”تم کیسے رہو گی اور کب تک رہو گی؟“ نوزید نے مرو کو پکار کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”آئی مین اسامہ بہت چھٹا ہے کیسے تم سے رہو گی؟“

نوزید نے شانے اٹکالیے۔ امین جتنا سوچتی سمجھتی جا رہی تھی، اسے بول بھی آندھ جیوں کی زد پہ آئے پتے کی مانند لرزے لگا تھا۔ رات ہی تو سلطان شاہ کا بیچام لے کر نوزید اس کے پاس آئی تھی۔

”تمہیں بلارہے ہیں۔“ اور امین کے کیا سر پہ لگی تو اس پر بھی دولا معاملہ ہو گیا۔ بغیر کسی لحاظ کے نہایت درخشی سے انکار کر دیا۔

”میں خود چل کر اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی آج ایک ماہ اندیش میری یاد آتی گئی ہے تو خود آ جاؤں۔“ وہ پھر بوجھل رہی تھی۔ شادی کے کوئین ٹیوں کے بعد یہ پہلا بار تھا کہ کچھ نظر اندازی کا غصہ تھا کچھ اپنی تبدیلی کا احساس مالتھ تھا۔ سچی غصے میں کہہ دیا نوزید کے سمجھانے کے باوجود وہ سنسنی رہی تھی مجبوراً نوزید کو سلطان شاہ تک اس کا انکار پہنچنا پڑا۔ اگلے ہی چند لمحوں بعد وہ دنا دنا ہوا اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ امین اس وقت شب خوابی کا لباس پہن کر ڈریننگ روم سے باہر آئی تھی۔ اسے یوں غیر متوقع طور پر سامنے پا کر نوزید ہی ہو گئی۔ وہ خراشا ہوا اس پر چھینٹا تھا۔

امین تو اس کے عام سے کسی حد تک نال روپ سے بھی خائف رہا کرتی تھی۔ اس طرح غضب ناک ہوتے دیکھ کر دم حلق میں اٹک گیا۔

”آج تک کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ مجھے۔ یعنی سلطان شاہ کو کسی بات سے انکار کرے۔ تم نے تم ہو کیا؟“ اس کا منہ ہاتھ میں دیوچ کر بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے سر پور اٹھایا۔ امین جو چندا ہے قبل مارے خوف کے دروہ پر واڑ کرتی ہوئی محسوس کر رہی تھی یک دم ہی ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی۔ جیسے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہے جا رہا تھا اب موقع ہے منوالے اپنا آپ اندر کی وہندی لا پرست و درخور امین انکڑائی لے کر جاگ اٹھی۔

”جب عزت نفس پر مسلسل چوٹ پڑے چندا کی حفاظت یوں ہی کی جاتی ہے۔“ سلطان شاہ غصے میں آئے سے باہر ہوا جا رہا تھا امین ایک دم ہی بھڑک سی گئی پوری قوت صرف کرتے ہوئے جھکے سے اپنا آپ اس کی گرفت سے آزر کو روک لیا جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے در آئی تھی۔ یہ سلطان شاہ کو اس سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔

”مانڈ پور لیگلون سسر شاہ قائم بھی تیز سے بات کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو تم میں سے ڈگنی ہوں۔ خرید نہیں ہے تم نے مجھے ہاں البتہ دھوکے سے حاصل ضرور کر لیا تو اس کا یہ مطلب.....“ سلطان شاہ اس کے یوں اپنے ہاتھ جھٹک دینے کے شک سے ہی نہیں اٹھا تھا۔ اس کے منہ سے برستے انگڑوں پر بالکل ہی حواس کھو گیا اگلے ہی لمحے اس کا وزنی ہاتھ نضا میں گھوم کر امین کے چہرے پر جا پڑا، امین الٹ کر بیڈ پر جا گری تھی جبکہ سلطان شاہ کو گیسر تا پاسک رہا تھا۔ اس پر جھٹکتے ہوئے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے کھینچ کر مقابل کھڑا کرتے ہی پے درپے مزید کہتے ہی تھپڑ اس پر سادیے مگر غصہ پھر بھی کی طور کم نہیں ہوا تھا۔ امین اس کی دردنگی کا فکاہ ہو کر ہر طرح سسکتی رہی۔

”ہاں اب بتاؤ کیا کہنا ہے مجھے تم یا آپ۔“ اسے پاؤں کی زوردار ٹھوک لگا کر جا رہا نہ انداز میں گھٹیت کر دوڑ پھینکتے ہوئے وہ اس وحشت سے چلا ہاتھ کہ امین کو اپنے کانوں کے پردے پھینٹے ہوئے محسوس ہوئے اس کا چہرہ جل رہا تھا۔ دونوں کے کنارے سے خون نکل کر گردن تک پہنچ گیا تھا۔ آنکھوں کی ٹہنی بھی چہرے کو بھونک گئی تھی۔

”بولو کیا پوچھا ہے تم سے؟“ وہ پھر سے دھارا۔

”آ..... آپ۔“ امین نے مزید تشدد سے بچنے کی خواہش میں گہرا ہٹ زدہ انداز میں بے بسی سے کہا تب سلطان شاہ نے عمارت بھری نگاہ اس پر ڈال کر چہرے کا رخ مولا لیا۔

”صرف پانچ منٹ میں حلیہ درست کر کے میرے بیڈروم میں آ جاؤ۔ پانچ منٹ کا مطلب چار تو ہو سکتا ہے چھ نہیں اور آئندہ مجھ سے گستاخی کا تصور بھی مت کرنا ورنہ۔“ درخت خولنے میں کہتا وہ آندھی طوفان کی طرح کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ امین نے لرزے ہاتھوں میں چہرہ و احباب لیا کچھ دیر پچھکیوں سے روٹی رہی پھر جیسے ہی اس کی وارننگ یاد آئی دل ہول کر رہ گیا۔ رونا بھول کر دوڑتی ہوئی قدموں سے اس کے کمرے تک آئی تھی جس وقت دروازہ کھل کر اندر داخل ہوئی ہر طرح ہانپ رہی تھی۔ سانسیں الگ بے ترتیب تھیں۔ سلطان شاہ کے ڈریننگ کی سمت اٹھتے قدم اس کی آہٹ پر چھٹے تھے۔ آکوری سے گردن موڑ کر دیکھا اسے یوں افسانہ و غیر اس کے کمرے کے بچوں کیچہد حواس دیکھ کر ہونٹوں کی تراش میں عجیب مسکراہٹ در آئی۔

”اتنی جلدی۔ حالانکہ میں نے کہا تھا حلیہ ٹھیک کر کے آ جاؤ اور حالت درست کر دو اپنی۔ روٹی بس روٹی عورت سے مجھے گھن آتی ہے۔“ عجیب سا سرد بین تھا اس کی آنکھوں میں اور پھر دروہ عمارت سے بوجھل۔ امین رو بولٹ کی طرح آگے بڑھی پہلے منہ ہاتھ دھو یا بال سنوارے پھر ڈریننگ گاؤں کی ڈویریاں کسے لگی۔ جس وقت سلطان شاہ ڈریننگ روم سے باہر آیا امین سر جھٹکائے صوفے پر بیٹھی اس کی خنجر تھی۔ سلطان شاہ نے عادت کے مطابق پہلے بال ہٹائے پھر پرفیوم اسپرے کیا۔ اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی ڈری کئی امین پہ نگاہ ڈالنا کوار نہ کیا تھا۔



”تو یہ وجہ ہے تمہاری مصروفیت کی؟“ مرو نے پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنا سب سابق درخشف اس کی بات کی گہرائی کو سمجھتا ہوا بنجید کی غور کیے بنا ہی ہے تماشہ نہیں پڑی۔

”ہاں مرو! دراصل ایک لنگٹ میرا شوق نہیں بخون ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ماں نے کب میری نئی مگر میں نے بھی سوچ لیا ہے اپنا یہ خوب ضرور پورا کروں گی۔“ مراد کی ماکواری محسوس کیے بنا وہ شرم ہو چکی تھی۔

”تو نہ کی ہوئی شادی ضروری تو نہ تھا۔“ اندر کا غیرت مند ناراضہ سر دھوٹ کھا کر بلبلاتا تھا۔

”کہاں کرتی تھی مگر ماں تو بس۔“ درخشف نے جھلا کر کہا پھر اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”میں نے تو سوچ لیا تھا اس آدمی کو مزہ پیکھاؤں کی مگر مرا تم تم مجھے پسند آگے۔ تم بہت چنڈم اور اسارت ہو۔ میری سہیلیاں میری قسمت پر رشک کرتی ہیں وہ کہتی ہیں مرو کہ جیسا ڈشنگ ہو چار رنگ بندہ تو اندھنری میں بھی نہیں ہے۔ جانتے ہو مرو لو میں نظم اندھنری کے سب سے خوب صورت ہیرو کے ساتھ فلمیں کرنے کے خوب دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ تم فلمی دنیا کے تمام ہیروؤں سے زیادہ لکڑ لنگ ہو۔“ درخشف اس کی تقریروں کے پل باندھ رہی تھی۔ بوروہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پہنوں کا ناچ ناچل چھٹا کے سٹوٹ کر کھڑا تھا۔ یہ وہ تو نہیں تھی جس کے متعلق مرو اوچھ جیسا صاف تھرے خیالات کا ماکھ شخص بہت فرمت سے سوچا کرتا تھا۔ جو کام اس کے تھے وہ کتنی ہولت سے کر لیا کرتی۔ مرو اوچھ نے اس کے حسن کی مذہب جملے کہے ہوں گے بوروہ پورا دیوانہ سناری تھی۔ اب وہ اسے فلموں میں کام کرنے پر اسکا رہی تھی۔ مانتے ہوئے لاؤ کر رہی تھی۔ اس کی بے تکلفی کا مظاہر ہو کر اس کے اعصاب پر بوجھ بن کر گر رہا تھا۔ اندر دل سے بیجان کو بڑھا رہا تھا۔

”تمہیں احساس تک نہیں ہے تم کیا چیز ہو باقی دلوں کے تمام پرستار تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں۔ بہت اثر انگیز قسم کی شخصیت ہے تمہاری۔“

مرغضی سانس بھرتے ہوئے اٹھ کر کھڑ ہو گیا تھا۔

”بلوہم روتم بولنے کیوں نہیں۔“ درنجف نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں کیا بے جا ضد کر رہی ہو؟“ مراد زوج ساہوکار سے دیکھنے لگا۔ اس وقت غصہ آگیا۔

”کسی بیوی ہو تم بڑی بات کا مشورہ دے رہی ہو شیم فاروق۔“ اس نے غمی سے کہتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا۔ دراصل درنجف کے خیالات جان کر اسے بے حد رنج ہوا تھا۔ غصہ انگ تھا وہ اسے کیا سمجھا تھا کئی کیا تھی۔

”کم آن مراد کسی دنیا نوی بات کر رہے ہو۔ اس میں منہ لانے کی کیا بات ہے یہ تو بہت عام سی بات ہے۔ فلموں میں سب ہیرو ہونا چاہتے ہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ درنجف! دنیا تو میں فلمی ہیرو ہوں اور نہ ہی ہماری زندگی کسی فلم کی اسٹوری ہے۔ جو ایسی چپ حرکتیں کرتا پھروں۔ تم نکل آؤ اس خیالی زندگی سے۔ اب تم سنگل نہیں ہو۔ کسی لور کی بھی زندگی تم سے وابستہ ہو چکی ہے۔“ مراد بہت کم غصے میں آتا تھا مگر اس وقت چمپر لوز کر بیٹھا۔ درنجف کی باتیں اس کی برداشت کا امتحان ہی تو ہوا کرتی تھیں۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔

”تمہیں یہ چپ حرکتیں لگتی ہیں اور وہ جو تم کرتے ہو ملائی بن کر ہر وقت نصیحتیں کرتے ہو۔ نماز خود پڑھتی ہے پر مجھ کو اس کیوں واعظ کرتے ہو اور وہ جو غمی مون پر لے گئے تھے تم کسی غمی کوئی اسپتال پہنچا رہے تھے تو کسی کونز پار کرتے رہے۔ ساری دنیا کا درد تمہارے ہی دل میں آتا ہے۔ مزہ خراب کر کے رکھ دیا تم نے تو میری زندگی جہنم بنا دی ہے۔“ درنجف اس سے زیادہ پلندہ آواز میں چیخنے لگی جانے کب کبھی یہی قسمی تھی۔ مراد بھونچا سا اسے دیکھتا رہ گیا وہ مذہب سے دور تھی۔ گیسٹس پسند کرتی تھی۔ فلمی اسٹارز کو آمیزیل رکھتی تھی مگر اس قدر بے راہ و ہوئی یہ مراد کے تصور تک نہیں تھا۔ اسے بہت دھچکا لگا تھا۔ بہت بڑی ٹھوکر کھائی تھی دل نے۔ وہ لوز بھی جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ مراد کے پاس جیسے الفاظ نہیں رہے تھے۔ سو بنا کچھ بھی کہے پلٹ کر باہر نکل گیا۔



”خادم حسین! جتنے بھی ملازم ہیں سب کو فارغ کرو۔“ سلطان شاہ آف وہلیٹ پینٹ کوٹ میں چلا ہوا خادم حسین سے مخاطب ہوا تھا۔

”جی سر کار۔“ خادم حسین بریف کیس اٹھائے پیچھے چلے ہوئے موندانہ ملازمین سر ہلا کر بولا۔

”آج شام میں آؤں تو تمہارے سوا گھر میں کوئی ملازم نظر نہیں آتا چاہیے۔ اور سناؤ اسے کہنا کہ گھر کا ہر کام خود کرے گی۔ کھانا تیار ہونا چاہیے۔ ڈسٹنگ فرسٹ کلاس ہو اس کے علاوہ اسلیم کو بھی وہی سنبھالے۔“

ڈرائیور اسے دیکھتے ہوئے الٹ ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر کے اسے پیشہ دیا۔ سلطان شاہ کے اشارے پر ہی شوگر نے ڈرائیو تک سیٹ سنبھال لی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔



مراد کا موڈ زیادہ دیر تک آف نہ رہ سکا اس کی سب سے بڑی وجہ درنجف سے دیوانگی کی حدوں کو چھوٹی ہوئی محبت تھی۔ درنجف کی ایک کوشش نے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے وہی کول کھادیا۔ اس روز مراد نے درنجف کی خواہش پر افس سے جھنجھ کر لی۔ سارا دن خوب مزے لڑائے گئے۔ پہلے شاپنگ پھری سائیز جانے کا پروگرام بنایا وہاں سے واپسی پر وہ لوگ رات کا کھانا کھا کر ہی گھر آئے تھے۔

”درنجف! ایک بات کہوں؟“ مراد نے اس کے جھکتے چہرے پر نگاہ جما کر کوئی تمہید باندھی۔

”پلیز اب جائے کی فرمائش نہ کر دینا مراد! سچی بہت تھک گئی ہوں۔“ درنجف نے دوپٹہ کھینچ کر اتارتے ہوئے دھڑکیں بٹک کر بے زاری سے کہا مراد کچھ خاموش سا ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی پل سنبھل کر بولا۔

”نہیں مجھے اس وقت چائے کی طلب نہیں ہے۔“

”پھر کیا طلب ہے؟“

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ نرم نرم غید روئی کے لگاؤں سے بچے کو بھی مٹی یاری بیدار بیچیاں۔“ درنجف کے منہ کے ذریعے مگڑنے لگے اس نے مارکوری سے مراد کو روک دیا۔ کچھ جوقینا اس وقت تصویریں کسی گل کھتنے سے بچے کو دیکھ رہا تھا۔ درنجف کی ٹھاکا سا تھوکر اس پر پھری گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب روشنی چھوٹ رہی تھی۔ آنکھوں میں بہت خوب صورت ہنر چھلک کر تے ہوئے اس کی خوب صورتی میں مزید انسانے کا سبب بننا تھا اور درنجف تو تھی ہی حسن کی شیدائی۔

”بھلا ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہوا گیا؟“ مراد ایک دم چوکتے ہوئے اس سے استفسار کرنے لگا۔

”معلوم نہیں۔“ درنجف نے روکھائی سے جواب دیا۔

”پتہ ہے درنجف! میرے اندر محبت کو پانے کی خواہش ہسکتی رہی ہے۔ ایسا ای حالات کی تمام نظر مینی سے لن کی تمہیں مجھ سے چھن گئیں میں نے بہت عرصہ گڑی دھوپ میں آبدار سڑک پر گریزے اندر پھر بھی بھٹیوں کا سمندر موجزن ہے۔ جس کی لہر لہر پر تمہارے لیے ہمارے آنے والے بچوں کے لیے بیارہا تھا ہے۔“

”لیکن مراد اتنی جلدی کیا ہے؟ بچے پیدا کرنے کو ساری عمر پڑی ہے۔ ابھی تو مجھے ابھی.....“

”کیا کرنا ہے تمہیں اور اچھا ہے خام خوب صورت سی مصروفیت مل جائے گی۔“ مراد اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا۔

”میرا گھر خراب ہو جائے گا مراد! ابھی تو مجھے اپنے شوق کی تکمیل کرنی ہے۔“ اس نے نزوٹھے پن سے کہا مراد کو پھر اس کی کاریت کے احساس نے گھر لیایا کچھ بھی کہے وہ اب بھیچ کر رہ گیا۔



ملازمین رخصت ہو چکے تھے۔ خادم حسین کی زبانی اسے سلطان شاہ کے احکامات مل چکے تھے یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ بھی اس صورت جبکہ آج تک کوئی کام ہاتھ سے کیا بھی نہیں تھا پھر اتنے چھوٹے کوچے کو سنبھالنا لیکن اس نے کسی قسم کا کوئی احتجاج نہیں کیا وہ جان گئی تھی سلطان شاہ اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ سلطان شاہ کا سابق رویہ تھا فوریہ لگے چند روزوں ہونے کو آئے تھے اسلئے اسے سلطان شاہ کو حیران کرنے دکھوینے کا جو پکچہ سا خیال ذہن میں پیدا ہوا تھا وہ سلطان شاہ کب کا ہواؤں میں کھیر چکا تھا۔ ایک بار پھر اس کا خوف ایسٹن کے اعصاب کو جکڑ گیا البتہ وہ اس بات سے مطمئن تھی سلطان شاہ کتنا ہی جاہر سنگدل اور ٹھک نظر تھا مگر بہترین باپ تھا۔ اسامہ سے اسے بے حد محبت تھی۔ کبھی کبھی تو ایسٹن کو لگتا جیسے دنیا میں سلطان شاہ جیسے خوش نوئی شخص کی کوئی کمزوری ہے تو وہ صرف اسامہ ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں ایسٹن کو امید کی ایک کرن نظر آتی تھی۔ سلطان شاہ کی مصیبتوں نما شخصیت میں داخل ہونے کا راستہ اسے بھائی دیا تھا اور وہ ایک ہی پر جوش ہو گئی۔ یہ خیال ہی سننے لگا تھا۔ سلطان شاہ کو کھوجنے اسے پانے کا خیال لیکن مشکل یہ تھی اسامہ فوریہ کا بیٹا تھا فوریہ کو اس کا دیدار دروازے کو کھولنے کی چاہ تھی یا نہیں ایسٹن کو ضرور تھی۔ جب لپا ک ہی اس کا دل انوکھی خواہش کر بیٹھا۔ سلطان شاہ تک رسائی کے لیے اسے بھی ایک دروازہ چاہیے تھا۔ وہ بھی مانتا ہے کہ درجے پر فائز ہو کر یہ کام نامہ انجام دے سکتی تھی۔ اس کا دل اس خیال سے ہی دھڑک اٹھا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے؟“



”مراد تم نے مجھے بتایا نہیں آؤں گا بڑا بھائی فلم پروڈیوسر ہے۔“ درنجف نے خود مطمئن رہتے ہوئے بھی اسے شاک لگا دیا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ مراد نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا نیٹکین سے ہاتھ پونچتے ہوئے اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی سرورہی کا عنصر شامل ہو گیا مراد نے محسوس کیا کہ اس سوال پر درنجف پشیمانی تھی پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بات بنا بولی۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ تمہیں کس نے بتایا آؤں گا بڑا بھائی فلمیں پروڈیوس کرتا ہے؟“ مراد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ہنوز اسی سروسے میں پوچھا۔

”وہ اخبار میں پڑھا تھا۔“

”او آئی سی مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا آؤں گا قدر شہور و معروف ہے۔“ مراد نے اس کے بھائی کو اس کے کام پر انٹرویو میں کروایا جاتا ہے۔“ مراد نے نظریہ مسکراہٹ سے کو یا اس کا مضحکہ اڑا دیا۔ درنجف کو لپا ک ہی اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا تھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ اس کی شکل آؤں سے ملتی ہے پھر نام بھی خاص ملتا جلتا ہے۔ تمہی میں نے اندازہ لگایا۔ تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔“ وہ اٹھنے ہی چلی چمکوں سکوں رونے لگی مراد بوکھلا گیا۔

”میں کب شک کر رہا ہوں پلیز رونا تو بند کرو۔“ مراد ٹھٹھکا تو تھا۔ مراد کی ایک بات پر وہ جس طرح گڑبڑاتی تھی اسے کچھ احساس ہوا تھا اور شک تو یوں بھی ہر انسان خاص طور پر مرد کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے مگر جو وہ سمجھا تھا اس پر یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جی درنجف کو چپ کراتے ہوئے بولا۔

”چلیا سادہ ہے تمہارا بھائی یہ صرف ایک مذاق تھا مذاق ہی نہیں جھنجھٹیں کی گئیں۔“ اس کے آنسو پردوں پر چھنے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ لہجہ پھر کو خیال دل میں جگہ بنا گیا تھا اس پر شرمسار ہو گیا۔ کتنا غلط سوچا میں نے۔ اسے خود پر مذمت ہونے لگی۔

”آئی ایم ساری درنجف! پلیز۔“ وہ جس قدر شرمندہ نظر آ رہا تھا درنجف بے ساختہ لڑ آنے والی ہنس کو نہ روک پائی۔

”اتندہ ایسا امت کہنا۔“ اس کے سینے سے سر جھپٹتے ہوئے وہ جس شان سے بولی اس نے مراد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیر دی۔

(باقی آئیہ)

پس ایک تاجن ہر جانی..... اس مریم..... دوسرا اور آخری حصہ

سلطان شاہ کے جانے کے بعد وہ طبیعت کی خرابی کی پروا کیے بنا کام میں جت لگی تھی۔ اسامہ سورہا تھا اور اسے لایج تھا اس کے جانے سے پہلے جو کچھ بھی ہو سکا ہے کر لے وہ بھی باپ پر پڑا تھا۔ ضد نہٹ دھری میں روئے پر آتا تو چپ ہوئے کا نام نہ لیتا۔

”بی بی جی! آپ کا خون ہے۔“ خادم حسین نے جین میں آ کر اسے مطلع کیا تھا سر ہلاتے ہوئے چہلہ بند کر کے وہ اس کے پیچھے ہی نکل آئی۔ قدم بڑھاتے ہوئے چائیک ہی سر پکڑ لیا تھا اور ہر منظر جیسے تاریک ہو گیا۔ منھلے منھلے بھی وہ گر گئی تھی۔

”بی بی جی! کیا ہوا؟“ خادم حسین لپک کر اس تک آیا تھا جب کہ اندر قدم دھرتا سلطان شاہ وہیں ٹھک سا گیا۔

”دور رہو خادم حسین! میں خود اٹھ جاؤں گی۔“ امین یوں سر جھک رہی تھی جیسے خود پر قابو پانے کی سعی کر رہی ہو۔

”بی بی جی! بی بی! اگر آپ کو ہوا کیا؟“ خادم حسین تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ سلطان شاہ نے اسے از خود اٹھتے دیکھا پھر انہی قدموں سے پلٹ کر چلا گیا۔ بیڑہم سے فائل اٹھائی اور واپس ہو گیا۔ امین ٹیلی فون اسٹینڈ تک آ گئی۔ ریسپونڈر اٹھا کر کان سے لگا گیا۔

”ہیلو ما! السلام علیکم۔“ وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی۔ ”جی طبیعت ٹھیک نہیں تھی بس یوں ہی پکڑ سا آ گیا کم آن مار پیٹانی کی کیا بات ہے۔ مروں گی نہیں۔“ دہلخ ہو گئی۔ ”واٹ؟“ اب کے وہ چونکی تھی۔ چہرہ تو سرخ سے سج گیا۔ ”ریلی ما۔“ وہ ایک دم سے چیختی تھی۔ ”میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جانی ہوں اوما کی گاڑی۔“ فون رکھتے ہی اس نے ہاتھ میں ایک چہرہ چھپا لیا۔ اگر ایسا ہو جائے تو فوج وہ جلدی سے اندر بھاگتی تھی۔ اسامہ کو جگا کر ساتھ لیا اور خادم حسین کو گاڑی نکالنے کا کہہ کر قریبی کلینک آ گئی۔

اور وہاں ما کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا تو گمان تک نہ تھا۔ خدا نے کتنی جلدی اس کی خواہش کو پورا کر دیا تھا۔ پھر اس خوشی میں اس سے کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہ ہو پایا۔ طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ وہ میڈنگ نے خوشی کو بھگا کر اس پر فحاش طاری کر دی۔ جس وقت سلطان شاہ آیا وہ نہ حال ہی بستر پر دراز تھی۔ سلطان شاہ چونکے بنا ریف کیس صوفے پر اچھال کر اس تک چلا آیا تھا۔

”تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رہا تو میں یاد دلاؤں۔“ لہجے میں تلخی سوئے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ تب امین خود کو سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے کوٹ اتار کر ہینگ کرنے کے بعد جھک کر جوتے اتارنے لگی تھی ایک بار پھر جی لگائے لگائے۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر گرتی پڑتی اور دم تک گئی تھی۔ حاصمی دیر بعد باہر نکلے تو پہلے سے زیادہ دھڑ حال اور زخمی ہوئی۔ سلطان شاہ صوفے پر نیم دراز ناگلین ٹیبل پر ٹکائے بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اشارے سے قریب بلا کر پتھر لے انداز میں سوال کیا۔ امین کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اسے بتانے کے خیال سے ہی ہاتھوں پاؤں میں سنسناہٹ ہوئے لگی کچھ کہے بنا اس نے جھجک کر سلطان شاہ کو دیکھا تھا گر ان گرم ٹکا ہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بلیکس لٹرز صبح عارضوں پر جھک گئیں۔

”کچھ پوچھا ہے تم سے“ کیا بھری ہوئی ہو؟“ وہ جھٹکے سے سیدھا ہوتا ہوا تیر لہجے میں خرا گیا۔

”وہ..... وہ..... میں..... آپ.....“ امین بری طرح گڑبڑاتی تھی بولکھا ہٹ میں منہ سے کچھ غیر واضح سے لفظ پھسلے تھے۔ جھجک اور جیبا نغ تھی وہ بھلا کب اس سے اس قدر بے تکلف تھی کہ یہ بات بتا دیتی۔ سلطان شاہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ امین باقاعدہ لٹرنے لگی اس کی قربت کسی امتحان سے کم نہ تھی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“ سلطان شاہ نے اس کا بازو حاکم کر جھٹکے سے رخ اپنی طرف پھیرتے ہوئے ترش روئی سے کہا۔ امین کا چہرہ پھر سے گلابی ہو گیا۔

”وہ..... میں دراصل.....“ بات مکمل کیے بنا وہ پھر سے ہونٹ کھلنے لگی۔

”تم مجھے یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تم پریگٹ ہو۔“ اف امین کو شاید سلطان شاہ کے یوں ایک دم منہ بھاڑ کر کہہ دینے کی توقع نہیں تھی۔ اسے ڈھیروں شرم نے اپنے حصہ میں لیا وہ پہلے ہی کم پل نہ تھی اب بالکل ہی ہلش کر گئی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رخ پھیرتے ہوئے باقاعدہ لٹرنے لگی۔ سلطان شاہ سلگتی بھڑکتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر زہر خند لہجے میں بولا تھا تو لہجے میں خود بخود ہی مس آئی۔

”اس قدر ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انک انک کر یہ بتانا چاہتی ہو کہ تمہیں بہت شرم آ رہی ہے۔ اونہ تمہیں اب پتہ چلا ہو گا میں تو بہت دنوں سے آگاہ ہوں۔ تم عورتیں بہت میا رہتی ہو کبھی مضمون بن کر مر دو لوتی ہو اور کبھی ایک دم ہی۔“ وہ ہونٹ بھیج کر سر جھٹکے لگا۔

”تمہارے لیے یہ دشوار امر کیوں ہوا؟ کیوں زخم نے مجھے آرام سے بتا دیا؟ کیا ثابت کرنا مقصود تھا؟“ اب وہ ٹپکتے ہوئے مسلسل اچھڑے جبار تھا۔

”مائی فٹ جانا میں ہوں عورت کو اچھی طرح سے اور اسے اس کی اوقات پر رکھتا ہوں۔ زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ساکت کھڑی سشدر سی امین کو آنکھیں دکھائیں اور مزید کو برائشانی کرنے لگا۔

”عورتیں عموماً پریگٹسی پریڈ میں اور پریگٹسی کے بعد بہت سر پر چڑھ آتی ہیں۔ مجھ سے ایسی توقع مت رکھنا۔ مجھے نفرت ہے ایسی عورتوں سے اور منہ مجھے بیٹا چاہیے صرف بیٹا۔“ اس کا لہجہ پتھر پلا اور کرخت تھا۔ آنکھوں اور چہرے پر عورت کا بھر پور تاثر۔ امین جو تب سے گنگ سی کھڑی اس کی زبان کے جوہر دیکھ رہی تھی بری طرح سے چونک گئی اور پھر جیسے احتجاجاً بولی تھی۔

”بیٹا“ مگر میرے اختیار میں کب ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ سلطان شاہ کا بھاری ہاتھ اس کا منہ پھیر گیا۔ امین کے اندر جیسے طوفان ٹھل اٹھے ایک پھیری ہوئی شوریدہ سر لہر اندر سے اٹھی اور اسے غصے کے سمندر میں بہا لے گئی۔ خود کو سنبھال کر وہ اس کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔

”بی بی جی! ہو گئی تمہارے ہاں سلطان شاہ! جانتے ہو کیوں؟“ تا کہ تمہارا یہ غرور ٹوٹے۔ شاید تم عورت کی قدر کر لو۔ تم درخت پر اگے تھے تمہیں جنم دینے والی بھی کوئی عورت تھی۔ تم ذہنی مریض ہو لینا رہو۔“ وہ حلق کے تل چیختی تو پھر خاموش نہیں ہوئی۔ سلطان شاہ جو اس کی کٹر کٹر چلتی زبان سے پکڑا گیا تھا ایک دم غصے سے پھر کر جارحانہ انداز میں اس تک آیا تھا اور نہایت بے دردی سے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا بیڈ پر لے آیا اس کے بعد جو اس کا ہاتھ اٹھا تو کتنی دیر تک نہیں رکھا۔ امین کو البتہ وہ خاموش کرانے میں ناکام رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ کس نے تمہیں درندگی پر مجبور کیا؟ کس نے جانور بنا دیا۔“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سلطان شاہ نہایت فحاشی سے اسے جھک کر باہر نکلتا چلا گیا تھا۔



مراد کی اداسیاں اور فسر دگیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ وہ محسوس کر سکتا تھا۔ درنخف اس سے دور ہو چکی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح بے تاب انداز کا انتظار نہ کرتی تھی اور نہ ہی اولین دنوں کی ہیبت کا اظہار کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا وہ انداز امر کے لیے تکلیف دہ تھا مگر یہ رویہ بہت ہی زیادہ اذیت کا باعث تھا۔ درنخف اس کی باتوں کے جواب میں صرف ہوں ہاں کرتی۔ کبھی کبھی رہا کرتی۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ ایسی کون ہو گئی۔ اسی وجہ سے وہ بے حد اپ سیت تھا۔ منھل سا اکتایا اکتایا۔ درنخف کی بار بار انگلی سے زندگی سے سب رنگ ہی اڑا دیے تھے وہ اس سے محبت نہیں عشق کرنے لگا تھا۔ نخف کی بے اعتنائی و بے پروائی اسے دکھ رہی تھی۔ کو کہ مرانے اسے مٹانے کی موڈ بھال کرنے کی کوشش کی ہر طرح سے منایا ڈھیروں شایگ کروائی ہو ٹنگ بھی کی مگر نہ سکرانی نہ ہی زندگی پر چھایا جو دلوتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نخف کو کیا چاہیے۔ اسے تو یہی خیال ہی نہیں تھا کہ وہ آفس چلا جاتا ہے تو درنخف کیسے وقت گزارتی ہے۔ خوش رہتی ہے کہیں جاتی ہے۔ کون آتا ہے؟



امین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اب وہ ٹھنڈوں میں منہ چھپائے ہوئے ہلے سسک رہی تھی۔ چہرہ سرخ اور آنکھیں تورم ہو رہی تھیں۔ طبعی بے حد کھرا ہوا سا تھا۔ سلطان شاہ وودن سے گھر نہیں آیا تھا۔ فو ز یہ بھی ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ اور اب اسے کچھ تاہور ہاتھ آ فر میں نے کیوں لڑائی کی ان سے کیوں برا بھلا کہا۔ خوف وحشت بن کر اعصاب پر چھانے لگا تھا۔ اس کا ذہن بیک وقت سوچوں کی زور پر تھا کبھی سوچتی سلطان شاہ کیسا کھورا آتی ہے کہ اس خوشخبری نے بھی اسے محور نہیں کیا۔ کبھی ذہن میں آتا کاش میں اسے کچھ نہ کہتی جانے اب کہاں ہو گا۔ چونکہ دل کو اسی محبت کا روگ لگ چکا تھا۔ اب کسی طور قمر انہیں تھا۔ اپنے تئیں تو اتنا کچھ اسے سنا کر اسے زہر انگٹنے پر آکھایا تھا۔ مگر اسے وہ طے کرنے کی کوشش میں وہ خود ہی کیس گھو گئی تھی۔ اسے آج اس اعتراف میں اٹھیں تھی کہ اسے سلطان شاہ سے محبت تھی محبت کے جواب میں محبت کی خواہش کچھ ایسی بے جا نہیں تھی مگر یہ بات سلطان شاہ کو لوں سمجھاتا۔



جس وقت مراد پھر پینچا پینچا وونی دروازہ چوٹ کھلا پڑا تھا۔ کسی انجانے خدشے نے پچکے سے دل میں جگہ پا کر خوف کی صورت دھڑک کر بوڑھا ڈالائیز قدموں سے اندر آیا تو ایک انہی عورت سے لکڑا ہوا۔

”آپ کون ہیں خاتون اور درنخف کہاں ہے؟“ وہ خنجر سا پوچھنے لگا۔ عورت اپنے دھیان میں کچن میں کھڑی چوہے پر کچھ پکڑا رہی تھی بری طرح سے چونکی پھر اس پر چڑھ پڑے ہی گھر لگتی گئی۔

”تم درنخف کے شوہر ہو؟“ سوال کے جواب میں سوال ہوا۔ مراد کو سخت کوفت ہوئی متلاشی کا ہوں کو ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے اس نے اثبات میں جواب دے کر پھر سے نخف کے بارے میں پوچھا۔

”نخف کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم فوراً اسے ہاسپٹل لے جاؤ۔“

”کیا؟“ اس اچانک افتاد نے اس کے حواس قفل کر دیے۔ ”کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ قدموں تلتے زمین مکتی محسوس کر رہا تھا۔

”وقت ضائع مت کرو جلدی کرو۔“ وہ عورت چیختی تھی۔ مراد گھبرا کر کمرے کی جانب بھاگا جہاں بیڈ پر درنخف بے سدھ پڑی تھی۔

”دوری دوری! بیلیز آنکھیں کھلو۔ کیا ہوا میری جان یہ کیا کر لیا تم نے؟“ پہلا خیال اس کے ذہن میں خود بخود آیا تھا بدحواسی میں باہر آیا تو اس عورت کو غائب پایا۔ وہ اسی طرح گرتے پڑتے گھر سے نکلا تھا پھر پڑوسی کا گیت بجا کر اسے درنخف کی طبیعت کے متعلق بتاتے ہوئے گاڑی نکالنے کا کہا تھا۔ پڑوسی نجیب صاحب نے اس کا شانزہ کھک کر تلی دیتے ہوئے نخف کو لائے کا کہا۔ مراد یوں یوں کی طرح دوڑتا ہوا واپس چلا تھا۔ اگلے گھنٹوں بعد وہ لوگ درنخف کو گاڑی میں ڈالے اسپتال کی سمت جا رہے تھے۔



اسامہ کو سلا کر وہ سلطان شاہ کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ ٹی وی دم آواز میں چل رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ گاڑی کے تیز بارن پر ہڑبڑا کر اٹھی۔ اسامہ پر

گجہ ڈالی جو ذرا کسمپاس کر دیا ہو گیا تھا۔ ایمن اسے تھپکنے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی سلطان شاہ بلوچٹ میں اندر چلا آیا۔ ایمن اسے دیکھ کر کچن میں چلی گئی۔ جب سے تمام ملازمین کی چٹختی ہوئی تھی۔ سلطان شاہ کو کھانا بھی وہی دیتی تھی۔ فرنیچ سے دو قسم کے سائن اور بریانی نکال کر اوون میں گرم کیا۔ سلاوی کی پلٹ ٹرے میں رکھی اور روٹی پکا کر تمام چیزیں سلطنت سے جانے کے بعد اندر چلی آئی۔ سلطان شاہ معمول کی مصروفیت نٹا کر اسے دیکھ کر پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایمن نے ٹرے پیر پر رکھی تب تک وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتا ہوا بلیڈ پر دروازہ کھل کر اسے دیکھ کر پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایمن نے تین دن سے نٹو اس سے بات کر رہا تھا اور نہ ہی کھانا کھاتا۔ ایمن نے آج دل میں ٹھان رکھی تھی۔ اس سے وجہ ضرور پوچھنے کی مگر اس کے سامنے تمام تہمتیں جواب دے جاتیں اس وقت بھی سر جھکا کر بوجھل قدموں سے سڑی تھی۔



مراوے تانہ اسپتال کے سرکوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ لیوں پر اس کی زندگی کی دعائیں پھیل رہی تھیں تبھی دروازہ کھول کر ڈاکٹر باہر آئی تھی۔
 ”ہیکسیکوزی ڈاکٹر۔“ وہ باسرت راستہ روکتے ہوئے درجنف کے متعلق استفسار کرنے لگا۔
 ”شکریں مسٹر مراد آپ کی وائف کی جان بچ گئی۔ ورنہ جس قدر اتنا تھانہ حرکت سرزد ہوئی ہے جان جانے کا خطرہ تھا۔“ ڈاکٹر کا خراب موڈ مراد کو پونڈ کا گیا۔
 ”مگر ڈاکٹر صاحب! انہیں ہوا کیا تھا مجھے بتائیے پلیز۔“ مراد کے استفسار پر ڈاکٹر نے باقاعدہ گھور کر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
 ”آپ مسٹر مراد احمد ہی ہیں نا؟“

”جی جی۔“ وہ قلمی سمجھ نہ پایا اس تعارف کی وجہ چھپی حیرت زدہ مایوس۔
 ”پھر بھی آپ نہیں جانتے ویری اسٹریٹ۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں لہجہ تھا۔
 ”بائے گاڈ ڈاکٹر پلیز میری برداشت کا مزید امتحان مت لیں۔ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے میری سز کو؟“ وہ مضطرب کھوتے ہوئے لجاجت سے بولا تب ڈاکٹر گہرا سانس کھینچ کر بولی تھیں۔
 ”پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کی سپورٹ کے بغیر وہ تمہارا لڑکا اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہے یہ آپ کا جائزہ نہیں تھا جو یہ سلوک کیا۔ آپ کی وائف کا چار ماہ کا حمل ضائع ہوا ہے۔ لبارش کروایا گیا ہے۔ اور اس قدر سفاکی سے انہیں کسی انجان نے موت کے کنوئیں میں اتارنے کی کوشش کی ہے کہ لاماں۔ اپنی وے یہ نقصان تو عمر بھر ساتھ چلنے والا ہے۔ آپ کو بہت سے کام لینا پڑے گا آپ کی سزا سب کچھ مائیں نہیں بن سکیں گی۔“ ڈاکٹر نے مراد احمد کے سر پر ہاتھ پڑتے چہرے پر گھڑا ڈال کر تسلی آمیز لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی جبکہ وہ ہاتھ پتھر کے بت کی مانند مساکت و سامت تھا۔ انجانے میں کتنا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ کیوں کیا نجف تم نے ایسا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ خبر تک نہ ہونے دی۔ سنو غم سے لبریز دل کے ساتھ وہ مٹھیاں بھیجے ہوئے بڑبڑایا۔

”کس نے حق دیا تمہیں مجھے اتنی بڑی خوشی سے محروم کرنے کا حق تھا تم نے یہ اسٹیپ لیا اور اتنا نہ بھی۔ اف مائی گاڈ۔“ اس نے پھٹکی آنکھوں کو میچے ہوئے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ ”درجنف میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ نوئیور۔“ اس کے اندر نفرت کا سمندر موجزن ہوا تھا۔



فوزیہ کو گئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ اب وہ بھی قدرے لیڈر جسٹ ہو چکی تھی۔ زندگی جیسے صبح سے شام تک کام کام اور بس کام کا دوسرا نام تھی۔ اسامہ بھی اب قدرے مانوس ہو گیا تھا۔ اسے لان میں پھٹکی دھوپ میں کھینٹا چھوڑ کر فیڈر بنانے کی غرض سے اندر آئی تھی۔ واپس آئی تو بے ساختہ چیخ پڑی۔ اسامہ مٹی میں بری طرح لت پت ہو چکا تھا۔ خادم حسین نے کچھ دیر قبل ہی پوروں کو پانی دیا تھا۔ گیلی گھاس پہ اسامہ اپنے کپڑے خراب کیے اب منہ بسور رہا تھا۔ خادم حسین کو ڈانٹ کر وہ اسامہ کو لیے اندر چلی آئی۔ رونا ہوا اسامہ اب نہاتے ہوئے طوفان برپا کیے ہوئے تھا مگر ایمن اسے اچھی طرح نہلا کر چھوڑے کا ارادہ بندھے تھی۔
 ”یہ کیا کر رہی ہو گوناوگرورت، کیوں رلا رہی ہو اسے؟“ اپنی پشت پر سلطان شاہ کی ہماری اور رنگ آواز سن کر ایمن کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔
 ”نہلا رہی ہوں۔“ اس نے بھی جواب پتھر پھوڑا تھا۔ چونہ دیتی تو گستاخ ٹھہرتی۔

”اتنی سردی میں نہلا رہی ہو۔ سان سنس فور کیا ہر نکال اور کپڑے پہناؤ اسے۔“ وہ قہقہا اسامہ کے رونے کی آواز سن کر ہی سیدھا ہواں آیا تھا۔ ایمن نے گہرا سانس لیا بھرتے ہوئے اسامہ کو بالوں میں لپٹا لیا اور باہر آگئی کپڑے پہنا کر اسامہ کو فیڈر دیا تھا۔ سلطان شاہ نے جھک کر روتے ہوئے اسامہ کو یاد کیا تھا پھر خشک سانس لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے رکھائی سے بولا۔

”آج کے بعد اگر تم نے بچے کو یوں رلا لیا تو ذبح کر دوں گا تمہیں سمجھیں۔“ وہ کوپا پھینکا رہا تھا۔ ایمن وہیں ہونٹ پیچھے کھڑی رہی۔ جبکہ سلطان شاہ دروازے کو زوردار ٹھوکر رسید کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔



مراوخت بدظن ہوا تھا درجنف سے۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی خود غرضی کے باعث مراد کا ناقابل حلائی نقصان ہوا تھا۔ وہ جاننا تھا درجنف نے ایسا کیوں کیا۔ وہاں مٹا ہی نہ چاہتی تھی اسے تیل تو اس نے مراد سے چھپنا چاہا تھا۔ دوروز وہ ہاسپٹل رہی۔ مراد اس کے پاس گیا نہ بات کی۔ وہ اس کی اولاد کی قاتلہ بنی تھی۔ نسل کی تباہی ویر بادی کا باعث ٹھہری تھی۔ اسے معاف کیسے کر دیتا۔ دل میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ مگر ضبط کے پلی شرط طے کرنا رہا۔ جس شام درجنف کو ڈسپنچر کرایا گیا اسی وقت وہ اسے ساتھ لینے کی غرض سے ہی آیا تھا مگر اس پر پھٹکی ڈال کر ہی بے گامگی اور سردی سب کچھ بھول بھال گیا۔ اسے درجنف کو دیکھ کر شدید دھچکا لگا تھا۔ یہ وہ درجنف تو نہ تھی جو شاہاب کی جاذبیت جس کی پہچان تھی۔ سو نے ہی دینی رنگت سروسوں کی مانند زرد تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بے رونق چہرہ اور کچھ ہوئے بال۔ مراد کا دل دھک سے رہ گیا۔ دل نے نظری اٹلی ظفر کی سمیت تمام خطائیں ملی بھر میں معاف کر دیں۔
 ”دوری ڈونٹ وری تم ٹھیک ہو جاؤ گی بھول جاؤ سب کچھ۔“ اس کا ہاتھ قائم رکھتے ہوئے محبت کے جام لانا لگا۔
 ”لیکن مراد میرا کچھ بھی تو اسے دیا میں آتا تھا۔“ وہ ایک دم سے بھسک کر رو پڑی تو مراد کی آنکھیں بھی جھپکے لگیں۔

”نہیں درجنف میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں مجھے سب سے زیادہ تم عزیز ہو۔ تمہاری خاطر میں بچوں کو بھول جاؤں گا کبھی نام نہیں لوں گا۔ پلیز مت روؤ ہم دونوں بھی بہت خوش رہ سکتے ہیں۔“ اس کی پیشانی پر بسوہ ثبت کرتے ہوئے وہ محبت سے معمور لہجے میں کہتا گیا اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔



سلطان شاہ کمرے کے بچوں سے منظر باندھنا یہاں سے وہاں نہیں رہا تھا۔ خوب صورت بادامی آنکھوں میں ہلکورے لیتا ہوا وہ منظر اری احساس بے حد نمایاں تھا۔ اس نے پیشانی کو مسلتے ہوئے کچھ سوچا تھا۔ جانے وہ کس سے خائف ہوا تھا خود سے یا ایمن سے۔ اسے خود سمجھ نہیں آئی۔ تخلیق کے مراحل فوزیہ نے بھی اس کے سامنے طے کیے تھے مگر جانے وہ اتنی دلکش دکھائی نہ دی تھی۔ یا تب سلطان شاہ کی آنکھوں کے رنگ جدا تھے۔ دل میں احساس نہ جا گا تھا۔ سلطان شاہ کو دیکھتا تو گجہ بے قابو ہو جاتی جھلا کر پیرے ٹھٹھاتا تو ہیک جاتی۔ وہ اس کے قرب کا خواہش مند رہنے لگا تھا۔ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تو سر اسر سلطان شاہ کی توہین تھی۔ وہ خاک کو کیوں کر سر پہ چالیتا۔ یہ تو اس کی شخصیت کی کمزوری تھی اور وہ کبھی ایسی کمزوری کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

جب اور کچھ نہ سوچا تو خادم حسین کو طلب کر لیا۔ خادم حسین دست بستہ موجود تھا۔
 ”خادم حسین کل تم اسے لے آنا۔“ خادم حسین مالک کے اشارے سمجھتا تھا فوزیہ کو لانے کا حکم ہوا ہے۔
 ”اب تم جاؤ۔“ خادم حسین موربانہ جھکا اور پلٹ گیا تبھی سلطان شاہ نے پھر پکارا۔ وہ رک کر مالک کو دیکھنے لگا۔

”کیا کرو اسے آج ہی لے آنا بلکہ ابھی جاؤ اور اسے لے آؤ۔“ خادم حسین نے سر ہلایا البتہ قدرے متحیر سا ہو کر اپنے درواز کا تخت خوب صورت سے مالک کو دیکھا اس کا فیصلہ ایک ہوا کرتا تھا اور وہ بھی اٹل کو یا پتھر پہ ٹیکر ثابت ہو کر تھا پھر چاہے نفع ہو یا نقصان۔ وہ فیصلہ بدلائیں کرتا تھا اور خادم حسین نے دیکھا تھا وقت ثابت کرتا رہا تھا۔ اس کے مالک نے جو بھی فیصلہ کیا تھا اس فیصلے نے سلطان شاہ کو سو فیصد فائدہ پہنچایا تھا۔ بحراب یہ مضبوط ستون کمزوریوں پر نہ لگا۔ مالک کی پریشانی اور اضطراب خادم حسین کی فکاہوں نے بھانپ لیا اور بے چین دکھائی دیے لگا۔ اس کا بی جا اپنے مالک سے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا کر رہا۔ سرکار خود کو مضبوط بنائیں۔ پہلے سے زیادہ اکثریں کہ آپ اسی طرح توجہ دیا رہے تھے ہیں مگر خادم حسین کو جرأت نہ ہو سکی سلطان شاہ نے اتنی محنت کے دی تھی۔



مراو درجنف کی بنیادی کے باعث بہت دنوں بعد آفس گیا مگر وہاں اس میں ہی اٹکار ہافون کے کرخیریت معلوم کرنا چاہی تو رابطہ نہ ہو سکا وہ مزید خود پر جبر نہ کر سکا اور اسی وقت آفس سے اٹھ گیا گھر پہنچا تو دروازہ حب معمول کھلا ہوا ہیک وہیں چھوڑ کر اندر چلا آیا۔

”اب مجھے بتاؤ آخر کب تک لٹکاؤ گے تم وہ تو شکر جان چھوٹ گئی۔ لیکن اس برس نے تو مجھے ماری ڈالا تھا۔ پیسے بھی لے لیے اور چھوڑ کر بھاگ گئی۔“ وہ جانے کسی سے فون پر نوحہ کر رہا تھا۔ مراد پر انکشاف ہم بن کر گرے تھے۔ وہ ساکت سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ درجنف اس کی آمد سے بے خبر کپے جا رہی تھی۔

”میں بے وقوف نہیں ہوں اگر اسے بتا دیتی تو وہ ایسا کرنے دیتا۔ میں ایسی کوئی زنجیر لپے تھوڑے دنوں میں ڈالنا نہیں چاہتی جو مجھ سے میرے خواب چھین لے۔ میرے کیئر کر کو تباہ کر دے۔“ مراد نے دکھ کے شدید احساس سمیت آنکھیں پٹی سے بند کر لیں کاش میں آج جلدی نہ آیا ہوتا اس کے دل سے سسکتے ہوئے دعا نکلتی تھی۔

”بس تم جلدی مجھ سے ملو میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے فلم سائن کرنا ہے۔ تم اپنے بھائی سے بات کرو۔ ملو! مجھے ان سے۔“ مراد میں مزید کچھ سننے کا پارانہ تھا بے جان قدموں کو گھسیٹ کر وہ لاؤنچ میں رکھے صوفے پر گر گیا۔ درجنف نے اس کے خون کا ہی خون نہیں کیا تھا اس کا اعتماد بھی کھیر ڈالا۔ کتنی بڑی غلطی کی تھی اس نے مگر وہ اٹلی ظفری سے معاف کر گیا۔ اب بھی وہ اسے معاف کر پائے گا؟ وہ تو عام سا انسان تھا اپنی بڑی آزمائش کیسے سہہ دیا وہ تو سیدھا سا داسا تھا بچے بولنے والا۔ دھوکہ نہ دینے والا دل کو کعبہ کچھ کر اترام کر لے والا پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔

”مجھے صرف اس بات کا جواب دو تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا سمجھتی تھیں مجھے کبھی خبر نہیں ہوگی۔ کس قدر گھٹاؤنا ہے تمہارا یہ خوب صورت چہرہ۔“ مراد نے اسے اپنی عدالت میں گھسیٹ لیا تھا۔ درجنف گہرائی میں پیشانی تھی شاید اسے مراد سے ایسی توقع نہ تھی مگر پھر سنبھل گئی۔

”اچھا ہوا میرا تو میں پتہ چل گیا۔ میرے لیے میرے خواب میری خواہش اہم ہے۔ میں اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ تمہیں بھی اور کیا سنا ہے۔“ وہ جیتی تھی۔ مراد کی کشادہ آنکھیں پھٹ پڑیں۔

”درجنف! تمہیں اپنی اس غصہ سے بڑھا ہوگا۔ تم نے بہت کچھ چھینا ہے مجھ سے مگر اپنی عزت میں داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ تمہاری خواہش بہترین زندگی کی ہے وہ میں تمہیں

دول گا گاڑی بٹلہ آئی پر اس وویو۔ درمی اتنی محنت کروں گا کہ تمہیں بہت جلد۔“

”یہ ڈائیلاگ مت بولو۔“ درنخف نے ہاتھ اٹھا کر اسے بدتمیزی سے ٹوک دیا۔

”یہ سہولت میں خود سے پاؤں گی۔ تم کسی مجھے خوشی سے کام کرنے دو۔“

”فونیور۔“ مراد چیخا پڑا۔ ”ایسا ممکن ہے۔“ مت مجبور کرو مجھے کہ میں تم پر سختی کروں۔ تم نے میری محبت دیکھی ہے غصہ اور نفرت نہیں۔ میں۔ یعنی مراد احمد جو کسی غیر مرد کے سامنے تمہیں گنگے سر نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیسے تمہیں فلموں میں جانے کی اجازت دے دوں۔“ مراد کے چہرے پر سختی در آئی تھی۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”کیا تو تمہیں کرنا پڑے گا مراد اہم کیا کرو گے میرے لیے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ڈربنا گھر اور ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی۔ یہ میرے خواب نہیں ہیں۔ تم میرے بہنوئی کے شہزادے سے بھی بڑھ کر چار جنگ ضرور، لیکن مجھے خالی خالی صحن چاہنا نہیں ہے۔ ان تمام آسائشات کو پا کر تمہارے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے فخر محسوس کروں گی لیکن یہ بھی سن لو۔ اگر تم نے ضد کی اور میری بات سے اختلاف کیا تو میں ہر انتہائی قدم اٹھا لوں گی۔ تم ابھی تک مجھے سمجھے نہیں ہو حالانکہ میں تمہیں جتنا چکی ہوں کہ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔“ درنخف نے از حد سفاکی سے کہا مراد ڈھک کر اسے دیکھتا رہ گیا پھر آہستہ روی سے اس کے قریب آ گیا۔

”درنخف اب کونسا انتہائی قدم اٹھاؤ گی بچا ہی کیا ہے۔“ دکھ سے لبریز آنکھیں اس پر بجا کر شکست خوردگی سے بولا درنخف اس کی بات سن کر بے ساختہ کھلکھلا کر فیس پڑی غاصی دیر بیٹے رہنے کے بعد ایک تیز و ترقی کا اس پر ڈالی تھی۔

”مراد احمد! تم سے علیحدگی اختیار کر لوں گی مگر فلم ایکٹر لیس ضرور ہوں گی کیا کر لو گے تم میرا ہم ہو کیا بہت کچھ سمجھتے ہو خود کو گھر کی خبر نہیں ہے تمہیں سنو مراد احمد میں اُن کی تربیت لے رہی ہوں تم تو آفس ہوتے ہو۔ میں اپنی من مانی کرتی ہوں صرف اپنی مراد اس انکشاف پر سن رہ گیا۔

”سنو مراد احمد جتنے تم سیدھے ہو کوئی مرز نہیں ہو سکتا، یقین نہیں آتا نا پھر پورا جاہت اور مردانگی اور یہ چند قسم کی معصومیت چیخ چیخ دکھ دوتا ہے تمہیں مرز نہیں عورت ہونا چاہیے تنہا وہ سنہرے لمبی تھی پھر لہرا کر باہر چلی گئی جبکہ مراد اٹھا کھڑا سا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔



فوزیہ تقریباً چار ماہ بعد آئی تھی پہلا کراؤ، ایمن سے ہی وہ ایمن اسے یوں غیر متوقع طور پر سامنے پا کر حیرت زدہ رہ گئی پھر خوشی سے چیختی ہوئی دوڑ کر اس سے مل گئی تھی فوزیہ جو اس کے بھرے بھرے جسم کو دیکھ کر لمحے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی اس کے چہرے پر پیار کرتے ہوئے شرارت سے فیس پڑی۔

”بڑے بڑے مہر کے سر کر لے ہیں“

اس کا اشارہ سمجھ کر جھپٹ کر رہ گئی تھی پھر بات بدلے ہوئے اس کا دھیان خود سے ہٹا گئی۔

”کہاں چلی گئی تھیں؟ کیا ہماری یاد نہیں آتی تھی۔“

”آتی کیوں نہیں آتی تھی تم یہ تاؤ میرے بیٹے کا خیال رکھا۔“ وہ اسامہ کو پیچھے پیچ کر پیار کرتے ہوئے بولی ایمن نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

”یہ صرف تمہارا بیٹا ہے جو ایسا کہہ رہی ہو۔“ فوزیہ جھٹلے ہوئے فیس دی پھر جیسے کچھ سوچ کر رازداری سے اس کی سمت جھکی تھی ”کون سا مہینہ ہے؟“

”پرل۔“ ایمن نے ناگہبی کے عالم میں بھولیں سے فوری جواب دیا۔ فوزیہ کھلکھلا کر فیس پڑی۔

”بیوقوف میں پوچھ رہی ہوں کون سا مہینہ ہے؟“ اس کے سر اُپے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی ایمن کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”چھٹا۔“ اس نے بمشکل یہ لفظ ادا کیا تھا۔

”وہ اس کا مطلب ہمارے یہاں۔۔۔۔۔“

”بلیز فوزیہ۔“ ایمن نے سخت سے سرخ پڑتے چہرے سمیت حاجت سے کہا تب فوزیہ کو بھی جیسے اس پر رحم آ گیا۔

”اُن سے محبت کرنے لگی ہو؟“ فوزیہ نے اس کا ہاتھ تمام کر رازداری سے پوچھا ایمن کی آنکھیں یکھٹ پائینوں سے بھر گئیں۔ اعتراف جس قدر دشوار تھا فرار اس سے زیادہ کٹھن وہ سر جھکائے ہونٹ کپٹے لگی۔

”چلو اس کا مطلب تم بھی مقتل گاہ کی جانب چلیں۔“ فوزیہ نے سر آدھ بھری تھی۔

”کک کیا مطلب؟“ وہ ہنپٹا کر بولی۔

”مطلب سلطان شاہ سے محبت کرنا کیا مرنے کے مترادف نہیں۔“ ایمن کے گلے میں آنسوؤں کا کولا سا انک گیا مزید وہاں ٹھہرا نہ گیا تو اٹھ کر تیزی سے اندر چلی گئی فوزیہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔



”پھر کیا سوچا تم نے مراد احمد؟“ رات وہ خامالیٹ آیا تھا۔ کھا اٹھا کھائے بغیر بستر پر دراز بے خواب آنکھیں چھت پر جمائے حالات کی تتم نظریں پر غمزدہ و طول ہو رہا تھا جب جھٹکے سے دروازہ کھول کر درنخف اندر آئی اور مڑیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ مراد نے خالی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا پھر گہرا سانس بھرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جانتے بوجھتے بھی کہ دانستہ انجان بنا دراصل وہ اس موضوع سے کترا رہا تھا۔

”بھولے مت۔ نو مراد احمد! تم جانتے ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں کیا فیصلہ کر پائے تم مجھے بتاؤ؟“ وہ شاید اس سے زیادہ بدداشت نہیں رکھتی تھی جی جی پڑی مراد نے اس کے پیچھے کی پروا نہیں کی اور اس درجہ اطمینان سے بولا تھا۔

”وہی جو کل تھا۔“

”یعنی تم مجھے فلموں میں کام نہیں کرنے دو گے۔“ درنخف نے تیوری جہا کر پوچھا۔

”ہاں۔“ مراد نے ہنوز اتنی انداز کو اپنائے رکھا کہ اسے جلا رہا تھا۔

”لو کہ تو پھر مجھے طلاق دے دو۔“

”شٹ اپ۔“ مراد نے ڈانٹا مگر وہ جیسے سن نہیں رہی تھی۔

”میں تم پر اپنا مستقبل بھروسہ نہیں کر سکتی۔ اپنی شدید خواہش کو تمہاری ضد کی بھیبت نہیں جہٹھا سکتی۔“

”درنخف تم ہوش میں ہو نہ کرو یہ بکواس۔“ مراد نے غصے سے گلزتے ہوئے کہا۔

”ہوش تو تم نے کھائے ہیں مراد احمد! میں تو میں تم جیسے انا پرست ضدی شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا، تم مجھے چھوڑ دو جان بخش دو میری۔“

”مراد اسے سچٹی سچٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

”ہوش بعد میں کھٹا مجھے فارغ کرو۔ طلاق دو مجھے ابھی اور اسی وقت۔“ وہ ہسٹریک ہو کر چیختے ہوئے اسے جھنجھوڑنے لگی مراد نے سخت طیش کے عالم میں اسے جھٹک دیا۔

”درنخف گلتا ہے آپ پاگل ہو گئی ہیں جیسی ایسی باتیں کر رہی ہیں کوئی بھی مرد ایسی بات اپنی بیوی کے منہ سے سننا پسند نہیں کرتا مگر میری مجبوری سمجھ لیں۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتا آپ اس وقت جذباتی ہو رہی ہیں سو جائیں پھر بات کر لیں گے۔“ مراد نے اندر لڑتے شدید اشتعال کو دبا کر زری سے بات کی کہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہا مگر وہ جو کب سے بہت غلط بیگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی نہ ہر خند سے فیس پڑی۔

”میں ختم ہو گئی تمہاری تقریر۔ تم سمجھ رہے ہو تم اس طرح مجھے دکھ دو گے دکھ تو اس طرح دے رہے ہو طلاق دے دو مجھے میں شانت ہو جاؤں گی بے زار ہو گئی ہوں میں تمہاری صورت سے تمہارا رے اس گھر سے اب کل کے سانس لینا چاہتی ہوں اور ایسا کرنے سے تم مجھے روک نہیں سکتے۔“ مراد کی آنکھوں میں سرنی اتر آئی۔ جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ بولا تو لہجے میں سے آگ برسنے لگی۔

”تو پھر سنو درنخف بیگم! میں تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا“ آج کے بعد تم گھر سے بھی باہر نہیں نکلو گی اگر میں نے تمہیں باہر دیکھا تو ناگہم لوڑ کے رکھ دوں گا یا اس خوش نما چہرے پہ تیز اب پھینک کر ساری خوبصورتی مٹا دوں گا۔ اسی پہ مان ہے۔ تمہیں یہ نہیں رہے گا تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ تم جو من مانی کر چکی ہو ختم اب اور نہیں۔“ اسے بیڈ پر ڈھکیں کر باہر نکل گیا جبکہ درنخف جنونی انداز میں ہنسنے لگی تھی۔



ایمن بیٹھ دادر ملک کی الگوتی لولاوتھی بچپن سے لے کر جوانی تک بے پناہ محبت چاہت اور اہمیت کو وصول کرتے ہوئے اسے کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ بے قدری کیا چیز ہوتی ہے۔ اسکول کا لڑکھو درنخف میں بھی وہ اپنی ذہانت اور سن کے بل بوتے ہمیشہ غاصی گردانی گئی تھی مگر جب سے اس گھر میں آئی تھی اتنی تیزی سے مل سکی تھی کہ خود سے ٹکھلائے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی۔ فوزیہ آئی تھی اس نے جان لیا۔ اب سلطان شاہ کو اس کی نہیں فوزیہ کی ضرورت تھی جیسی مزید تھپک سے بچنے کی خاطر از خود ہی اپنے بیڈروم میں شٹ ہو گئی۔ رات وہ تقریباً غنودگی میں تھی۔ جب فوزیہ نے اسے آکر سے بولکھلا کر رکھ دیا۔

”تمہیں بلار ہے ہیں۔“

”وہاٹ؟“ اس کے سر پر کوبہا دکھا ہوا تھا۔ دن بھر ہونے والی کارگزاری میں وہ اپنی خطا سونپنے لگی۔ جس کے جرم میں اس پر تیش ہوئی تھی۔

”کیا سوچے لگیں۔ ہری اپ بلیز۔“ فوزیہ نے اسے گم سم اور قدرے حواس باختہ دیکھ کر کندھا تھام کر گھنٹھوڑا۔ وہ بری طرح سے چونک گئی۔ پھر ٹائٹ ڈریس پر مثال اچھی طرح پھیلاتے ہوئے اٹھ کر ہولتے ہوئے دل سے دعائیں لگتی سلطان شاہ کے روم تک آ کر کاک کیا تھا پھر ہلکے سے تاب گھما کر اندر داخل ہو گئی۔ سلطان شاہ آہٹ پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”کہاں تھیں تم؟“ اس کا چہرہ کرحٹ اور آنکھیں تلخی سے مٹے تھیں۔ ایمن کی تھیلیوں میں پسینہ اترنے لگا۔

”اپنے بیڈروم میں۔“

”کس نے اجازت دی تھی کیا میں نے تمہیں جانے کے لیے کہا تھا؟“ وہ پھنکارا ایمن اس کا بڑا ہوا سو دیکھ کر خوف سے لرزنے لگی۔

”نہیں۔“ ہلکاتے ہوئے بمشکل بول پائی۔

”تو پھر تمہیں جرات کیسے ہوئی۔ اپنی اوقات میں رہو سمجھیں۔“ اس کا بازو سلطان شاہ کی آغوشی گرفت میں کسا جا چکا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں بالاب

پانیوں سے بھر گئیں۔

”کیا سمجھنے لگی ہو؟ خود کو۔ میں نے تنبیہ کی تھی۔“

”جی جی۔“ وہ اپنا بازو چمڑے کی کوشش میں سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

”بلیئر مجھے چھوڑ دیں۔“ اس نے کراہ کر منت بھر لے لی تھی۔ سلطان شاہ کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اسے جھٹکے سے دور کرتے ہوئے دھڑکنے لگی ہیرا گھڑا ہو گیا۔ امین خود کو سنبھالتی تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔



طبیعت زیادہ خراب ہونے کے باعث سراب جلدی افس سے گھر آ گیا۔ رات بھی اسے حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ جواب تیز بخار میں بدل گئی تھی۔ پچھلے کئی دنوں کے ذہنی خلجان نے اسے پیار کر ڈالا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا اب اس کے لیے باعث حیرت نہ تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کرنا ہوائی وہ اندرونی حصے کی جانب بڑھا تھا بیڈروم کا دروازہ ہلکا سا کھڑا ہوا تھا۔ کمرے سے سرکوشیوں کی آواز باریک آ رہی تھی۔ مراد پھر بھی نہیں چونکا۔ اب اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ درجنف کو کسی بھی وقت ایکٹنگ کا دورہ نہ جاتا تھا۔ دروازہ کھل کر اندر داخل ہوتے ہی وہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ نہ قدموں تلے زمین سر کی تھی نہ آسمان ٹوٹا ہوا ہر تو کچھ بھی نہ ہوا تھا مگر مراد احمد پر قیامت ٹوٹ گئی۔ درجنف آرزو کے ساتھ تھی اور دونوں جس قابلِ اعتراض حالت میں تھے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی مراد غیر یقین نہ تھا۔ درجنف بے باک تھی بولڈ تھی مگر بدمذکر وار ہو گئی یہ تو اس نے کبھی تصور تک نہ کیا تھا۔ دونوں جانے کب سے اس کی آنکھوں میں دھول چھوٹ کر رہے تھے اور وہ بے خبر رہا تھا۔ مراد نے لڑکھڑاتے ہوئے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا تھا۔ اسے خود کو کمزور کرنے میں خاصی دقت کا سامنا تھا جبکہ وہ دونوں اس کی آمد سے بے خبر اس قدر کھوئے تھے کہ آس پاس کی خبر نہ تھی۔ مراد کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر جیسے وہ اپنے حواس کھو گیا تھا۔ دروازے کو زوردار دھوکا رسید کرتے ہوئے چینا ہوا آواز پر ٹوٹ پڑا۔ آواز اس کا ایک اقدام کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ مراد کو سامنے پاتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بوقتِ تو درجنف بھی تھی مگر جلد سنبھل گئی۔ اس اثناء میں مراد نے آرزو کا اچھا خاصا حلیہ بگاڑ ڈالا۔ وہ اسے منہ سے دیکھنے کا موقع دینے کے لیے ہاتھ کاٹی کر رہا تھا۔

”مراد! میری بات تو سنو۔“ آواز اپنا چہرہ اس کے گھونٹوں کی زد سے بچاتے ہوئے چلا یا۔

”آئی سے شٹ اپ! مت مام لوانی گندی زبان سے میرا میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔ تم نے میرا اعتماد ڈنڈا۔“ مراد نے پٹیل کا گلہ ان اٹھا کر اس پر دے مارا۔ آرزو کا چہرہ ہلکا ہوا تھا۔ اس نے قہر سے کہا کہ مراد مزید کوئی ایکشن لینا آرزو کو کھانے کا موقع مل گیا۔ مراد نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ منہ میاں بچھتے ہوئے درجنف کی طرف چلا جس کے چہرے کا سارا خون آرزو کا شر دیکھ کر کچھ چپکا تھا۔

”لو تم۔“ اس نے اٹھ کر اسے گھورا۔ درجنف بے ساختہ سسکی ہوئی اس کے سینے سے آگئی۔

”مراد! وہ..... وہ مجھے زبردستی۔“ مراد نے نہایت تھارت سے اسے جھٹک دیا۔

”دور رہو مجھ سے گھن آ رہی ہے مجھے تمہارے لمس سے۔ تم قاتل ہو میرے اعتماد کی میری نسل کی اور میری خوشیوں کی بھی۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ کتنا بے وقوف تھا میں! تم سے محبت کرتا رہا۔ تمہارے دل میں اپنے لیے محبت تلاش کرتا رہا۔“

”بلیئر مراد! میری بات سنو۔ آرزو نے زیادتی کی ہے مجھ سے۔ بلیئر مراؤ سنو سی۔“

”شٹ اپ اب میں تمہارا کبھی یقین نہیں کروں گا تمہارے آنسو جو میرے ہیں تمہاری زبان اور دل کی طرح۔ تم جاہلی تھیں میں تمہیں طلاق دے دوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ چلی جاؤ ہمارے درمیان وہ بندھن ٹوٹ گیا جسے تم نے دل سے باندھا نہ قبول کیا اور رشتے دل کے ہی ہوا کرتے ہیں۔ خون کے رشتے ٹوٹ بھی جائیں دل کے نہیں ٹوٹا کرتے۔ شام میں میں آؤں تو تم یہاں نظر نہ آؤ۔“ وہ چلا تھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ درجنف لمبی تھی اور فحش مچ گئی۔



فوزیہ کو آئے ہوئے بھی مہینہ ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ سب ملازمین بھی واپس آ گئے تھے۔ امین کو خاک سمجھ نہ آ سکی۔ سلطان شاہ کے اس اقدام کے پیچھے کیا سہارا تھا۔ شاید وہ اس کا ضبط آزما جاتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اس کے نزدیک یہ بات اہم نہیں تھی۔ خود پر پڑنے والی اس آزمائش میں ہی اس نے جانا تھا۔ عورت موم کی طرح حرم ہوتی ہے۔ حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں دین نہیں لگاتی۔ اس نے یہ سب کام نہیں کیے تھے تو کیا ہو اگر یہ سب کچھ اس کی فطرت میں موجود تھا۔ جسے اس نے قبول کر لیا تھا ان دنوں اس کی حالت کے پیشِ نظر فوزیہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ دوسرے ملازموں کی موجودگی میں کام رہے بھی نہ تھے۔ اسامہ کی ذمہ داری بھی اب فوزیہ پر تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے سلطان شاہ اس سے التعلق بنا ہوا تھا۔ ناشتے کی ٹیبل اور کھانے کے وقت ہی اس سے سامنا ہو پاتا مگر امین اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں جو اس کے جسم کی ہیئت ہو رہی تھی۔ اسے سلطان شاہ کے سامنے جاتے ہوئے بے تحاشا شرم محسوس ہوتی۔ حالانکہ وہ کبھی بھی خصوصاً اس پر نگاہ نہیں ڈالتا تھا۔ پھر بھی امین جھٹک جاتی چونکہ فراغت تھی اور خالی ذہن سوچوں کا گھر ہوتا ہے۔ سو اس نے بھی بے شمار لالچی سی سوچیں پال لی تھیں۔ جانے کیوں وہ بے مقصد سلطان شاہ کو سوچتی رہی۔

اس وقت بھی سلطان شاہ کی بے نیازی حد سے زیادہ سلسلش سوچ اور غرور و نخوت کے بارے میں فکر مند سی سوچ رہی تھی جیسی ذہنی رو بہک گئی۔ جب یہ غصے میں تانا بندا ہوا وقت گزرتا رہتا اور بے نیازیوں میں اتنا چلتا ہے تو مسکراتا ہو یا ریا کرنا ہو اس قدر بیدار لگے گا۔ اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دی۔ تھی سلطان شاہ کو کچھ کر چوکتے ہوئے سیدی ہو گئی۔ سلطان شاہ ٹی وی لاؤنچ سے ہوتا تیز قدموں سے بیڈروم کی سمت چلا گیا تھا۔ پیچھے پیچھے گھبراہٹ بولکھایا خادم حسین بھی تھا۔ جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سلطان شاہ کی سفید براق شرٹ خون سے رنگین ہو چکی تھی۔ مٹنی تیزی سے وہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی اور جس رفتار سے دل چاہے گہریوں میں ڈوب رہا تھا اگر حواس سلامت ہوتے تو خود بھی ششدر رہ جاتی۔ سر پٹ بھاگتے ہوئے وہ دروازے سے اندر آئی فوزیہ سے ٹکرائی۔ فوزیہ بھی یقیناً سلطان شاہ کی خون آلود شرٹ دیکھ چکی تھی۔ جیسی متوحش سی دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں کی نگاہیں چارہوئی تھیں۔ دونوں ہی حراساں وجہ کل تھیں۔ آنکھوں میں بہت سے سوال و حیرت بھر رہے تھے۔

”وہم نے دیکھا سلطان شاہ؟“ امین کی دلی کیفیت لہجے کی لہریش اور پی سے عیاں تھی۔

”ہاں مگر تم یہاں بیٹھو۔“ فوزیہ نے حواس قابو میں کرتے ہوئے اسے بازو سے کچڑ کر اندر لے جانا چاہا مگر وہ بری طرح جھل کر اپنا آپ چمڑا گئی۔

”نہیں مجھے اندر جانے دو۔ انہیں چوٹ آئی ہے۔ ہماری ضرورت ہوگی۔“

”نہیں امین! بیوی میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ جب خادم حسین ان کے ساتھ ہو پھر انہیں کسی اور کی طلب نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔“ فوزیہ نے دوبارہ اس کا بازو پکڑا جسے امین نے دھڑکی سے جھٹک دیا۔

”میں ضرور اندر جاؤں گی۔ چھوڑو تم مجھے۔“

”امین! امین!“ فوزیہ اسے پکارتی رہی مگر وہ نظر انداز کیے تیزی سے سلطان شاہ کے بیڈروم میں آ گئی۔ سلطان شاہ شرٹ کے ٹکڑے کھولتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔

”تجھی اس کی نگاہ امین پر جا پڑی۔“

”کک کیا ہوا ہے آپ کو؟“ امین لپک کر قریب آتے ہی بے تاب سی بولی۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ سلطان شاہ نے جھٹک کر شرٹ اتار کر دور پھینکتے ہوئے غصے سے کہا۔ امین نظر انداز کیے قریب آ گئی۔

”کہاں رخم ہے مجھے دکھا میں۔“ سلطان شاہ اس پر سرد نگاہ ڈال کر میڈیکل کس لیے اندر آتے خادم حسین کی سمت متوجہ ہو گیا۔ تھینا اسے کوئی لگی تھی۔ داہنے شانے سے ذرا نیچے بازو پر ی طرح فحش تھی۔ خون ابھی تک نکل رہا تھا۔ امین کا اسے دیکھ کر دل کر رہا تھا جبکہ وہ یوں اطمینان سے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ خادم حسین اس کے اشارے پر ہی رخم صاف کرنے لگا تھا۔ سلطان شاہ کی ہدایت کے مطابق رخم گرم پانی اور پھر پٹ سے دھو کر پٹی باندھ دی۔ امین وارڈروب سے اس کے لیے شرٹ نکال لائی۔

”اب تم جاؤ خادم حسین۔“ خادم حسین فوری حکم بجالایا۔ امین تیزی سے آگے بڑھ آئی۔

”آپ کو گرم دودھ کی ضرورت ہے۔ آپ یہ شرٹ پہن لیں۔ پھر میں دودھ لاتی ہوں۔“ امین نے شرٹ اس کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا اور یہیں سلطان شاہ کا ضبط چھٹک گیا۔

”لوہٹ اب تو اب تم مجھے بتاؤ گی مجھے کیا کرنا ہے۔“ وہ پھنکارا تھا اور خرت طیش کے عالم میں اسے پیچھے دھکیل دیا۔ امین خود کو سنبھال نہ سکی منہ کے بل گرتی مگر اس سے پہلے ہی جانے کس جذبے کے تحت سلطان شاہ اسے بازوؤں کے مضبوط حلقے میں محفوظ کر لیا۔ امین کی سانسیں اٹھل پٹھل ہو گئیں۔ سلطان شاہ اگلے ہی ہلکے سے جھٹک چکا تھا تھا۔

”دفع ہو جاؤ اگر اس حال میں نہ ہو تمیں تو اس گستاخی کا انجام ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتیں۔ اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے وہ سرد لہجے میں غرا۔ امین کی آنکھیں ڈبڈبائیں گئی جلدی اوقات یاد دلادی تھی۔ ابھی تو وہ پوری طرح خوش فہمی کو پال بھی نہ سکی تھی۔ خوش ہونے بھی نہ پائی تھی۔ تم پتھر ہو سلطان شاہ کی بات تمہارا جو میری خوشی کو خوش رہنے دیتے آنسو پیتے ہوئے وہ سسکیاں روکتی بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔



درجنف خوش تھی۔ اپنی آزادی پر کوہِ حشر منار ہی تھی۔ مگر امین گہرے سوگ میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ مراد نے طلاق لینے کی بابت اگرچہ اس نے ماں کو بتانے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یہ الزام اس پر ہی لگا جاتا تھا مگر ماں ماننے سے انکاری ہو گئیں۔ انہوں نے بری طرح سے درجنف کو پیٹ ڈالا۔

”امی مجھے ہی بد خدشا تھا تجھ سے ہر وقت سولی پر لگی رہتی تھی۔ کیا لگ گیا تھے بتاؤ سہی۔ جانی نہیں ہوں کیا تیرے لیے ٹھکانے۔ ارے وہ تو بہت سیدھا بچہ تھا۔“ درجنف کا حلقی کڑوا ہوا گیا ماں کی گالیاں کو سننے کی سخت بدمزہ ہوتے ہوئے بدحالگی سے چلا اٹھی۔

”ہاں میرا ہی تصور ہے۔ میں نے ہی طلاق لی۔ کہا تھا نہ تم سے ماں مجھے شادی نہیں کرنا۔ اب دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ۔ مجھے اب تم بھی فلموں میں کام کرنے سے نہیں روک سکتیں۔“

”کیا ہے ان فلموں میں۔ آسید کو دیکھا مجبور ہی تھی جب نہیں رہی تو گھر بسلا۔“ امی اسے دیکھنا اسے اگر غیرت پکڑنی ہو تو بہت مثالیں۔“

”تم میرے معاملات میں مت بولو ماں۔ مجھے اپنی مرضی سے بھیجنا پورا حق ہے۔ دیکھنا میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاؤں گی یہ مراد احمد تو کیا اس طرح کے ہزاروں میرے قدموں کی خاک مٹا اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔ اسے چھوڑ کر میں نے اپنا نقصان نہیں کیا ماں بلکہ خوش بختی کے دروازے پر دستک دی ہے۔“ ماں نے ہنس بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر جیسے پھٹ پڑیں۔

”لغت ہے تیری سوچ پر ماری تھے کیا خبر تو نے اپنا کیا نقصان کر لیا۔ قسمت سے ایسا مرد ملا تھا جس کی تو نے قدر نہ کی۔ اپنی کوکھ اپنے ہاتھوں جلا ڈالی۔ بول کون گلے لگائے گئے تھے کرموں چلی تھے تو درد کی ٹھوکریں کھانا ہیں۔ ابھی کہاں تھے احساس ہو گا کبھی روئے گی سر تھا تم کر۔“ انہوں نے منہ پر چادر ڈالی اور رونے لگیں۔ درجنف نے ان کی گریہ زاری کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے بس کھول لیا اور وہ زور پورت نکال کر دیکھنے لگی۔ جو وہ مراد کے گھر سے آتے ہوئے سمیٹ لائی تھی۔



فوزیہ نے امین کا نام شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر کے پاس لکھوایا تھا۔ وہی اسے ہر بار چیک اپ کے لیے لے جایا کرتی۔ امین کی کنڈیشن کے پیش نظر ڈاکٹر خاصی فکر مند تھی۔ مقررہ ڈیٹ سے ایک دن پہلے ہی امین ہسپتال جانے کو تیار ہو گئی۔ چند روز قبل ہی ملا بھی اسے ملے آگئی تھیں۔ بہت مضطرب محسوس کیا تھا۔ امین نے انہیں۔

”تم خوش تو ہو امین؟“ اور امین ہنس دی تھی۔ عجب کھوکھلی ہی ہنس اب کیا فائدہ اب تو ہم ہاری چکے اپنا آپ اس نے مٹل سوچا تھا۔ ماں کو ڈھارس بندھ چکی تھی۔

”میں بہت خوش ہوں ماں! آپ پریشان نہ ہوا کریں۔“

”جب تم فارغ ہو جاؤ تو پھر ضرور آنا۔“ ان کے بچے میں امین کے لیے وہی محبت تھی وہ سکر ادنی جبکہ ملا جیسے کچھ یاد آنے پر اس کی سست جھک کر راز داری سے بولی تھیں۔

”سلطان شاہو! چھاپے ہاتھ ہمارے ساتھ؟“

”جی۔“ وہ یہاں بھی اپنا دکھ ظاہر نہ کر سکی۔

”جے تو سلطان شاہ بہت پیارا بچہ مگر عادتیں کچھ عجیب سی ہیں۔ سنو کیا اب بھی جو اٹھتا ہے۔ سنا ہے بہت خطرناک کام کرتا ہے موت کو گنگے لگانے والے۔“

”جی۔“ امین سسند رہ گئی۔

”بیٹی اسے سمجھاؤ آخر کیا کرے گا اتنی دولت جمع کر کے۔ یوں بھی دوشادیاں تو کر چکا ہے۔

اس کے پاس ملا کی کسی بھی بات کا تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ آج کل تو یوں ہی دل بہت بوجھل سا رہا کرتا تھا۔ اسے آنے والے وقت نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ جو زندگی اور موت کا مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ اسی رات سلطان شاہ نے کھانے کی ٹیبل پر کہا تھا کہ کل وہ ہسپتال چلی جائے مجھے عورتوں کا رونا چننا کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے یہ کہتے ہوئے امین نے اس کے جوہر چہرے پر زمانے بھر کی بے زلمی اور نا کواری محسوس کی تھی۔ آنکھیں جب معمولی سلگ رہی تھیں۔ فوزیہ صبح سے اس کی تیاریوں میں لگی تھی۔ ملازمہ اس کے ساتھ جا رہی تھی جبکہ خادم حسین گاڑی لیے بالکل تیار تھا۔ امین خوب بڑی چادر میں لپٹا وجود چھپائے سست روئی سے پورچ تک آتی تھی، ابھی سلطان شاہ کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی اور پوریکو میں آن کر بیٹھنے کے رک گئی۔ خادم حسین نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔ باہر نکل کر وہ سیدھا اس کی جانب ہی چلا آیا۔ امین جو بے خیالی میں اسے دیکھے جا رہی تھی یک دم ہی چونک کر گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے لگی۔

”رکو۔“ سلطان شاہ کی خشک آواز پروہ میکا کی انداز میں سیدھی ہو گئی۔

”تمہیں یاد تو ہو گا میں نے کیا کہا تھا تم سے۔“ سرسری سی نگاہ اس کے سراپے پر ڈال کر وہ سر دھچکے میں مخاطب ہوا تھا۔ امین کی آنکھیں بھری چٹوہوں میں سوال انداز آیا لیکن کچھ بول کر اس کا تہرہ خود پر برسا نہیں چاہتی تھی۔

”واہی پر تمہارے ساتھ میری لولاد بیٹے کی صورت میں ہونی چاہیے۔ یہ تو تمہیں پتہ چل گیا ہو گا میں بہت شدت پسند ہوں۔ بیٹا صرف بیٹا۔ ورنہ جو ہو گا اس کا تمہیں اندازہ ہی ہو گا۔“ امین جو لب بھینچے خاموش اس کی دھچکی آئیز گنگنکوں رہی تھی۔ مزید ضبط نہ کر سکی تو تلخ ورتش لہجے میں کویا ہوئی تھی۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ سلطان شاہ کا یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اولاد مرد کا نصیب ہوا کرتی ہے۔ جو آپ کے نصیب میں ہو گا وہی ملے گا۔ البتہ آپ کا غرور دیکھتے ہوئے میرا جی چاہ رہا ہے۔ آپ کو بد دعا دوں آپ بیٹی کے باپ نہیں تاکہ آپ کا یہ غرور اور ضد منہ کے بل جا پڑے۔“ ضبط کی کوشش میں سلطان شاہ کا چہرہ دہک کر اٹھ رہا ہو گیا اگرچہ خادم حسین انہیں باتیں کرتے دیکھ کر خامسے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ اس کے باوجود سلطان شاہ نے نگاہ اٹھا کر اسی سست دیکھا پھر قدم بڑھا کر امین کے بالکل قریب آن رکھا۔ اس کے چہرے کے غضب ناک تیور اور آنکھوں سے لڑتا خون امین کو اندر سے لرزہ لگا مگر بظاہر اسی مضبوطی سے کھڑی رہی۔ سلطان شاہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام کر جھٹک دیا۔ امین لڑکھڑا کر اس کے سینے سے آگئی۔

”اس وقت اس لیے چھوڑ رہا ہوں تمہیں کہ میرے جگر کے کٹڑے کو اپنے وجود میں چھپائے کھڑی ہو لیکن جب لوگوں کی خواہش پوری نہ کی تو یہ تمہاری بد دعا اثر ہو گا اور اس کی کیا کڑی سزا ہو گی یہ وقت بتائے گا۔“ ایک ایک لفظ جبارا کرتے ہوئے وہ بھوکے شیر کی مانند غرا رہا تھا۔ اس کی گرم سانسیں امین کا چہرہ جھلسا رہی تھیں۔ امین کی ساری بجاوردی دھری رہ گئی۔ اسے اپنا آپ ٹوٹا ٹکڑا محسوس ہوا۔ سلطان شاہ جھٹکنے سے اس کی کلائی چھوڑ کر پوریکو سے چلا گیا۔ امین نے خود کو گرنے سے بچانے کی خاطر گاڑی کا کھلا دروازہ تھام لیا۔ خادم حسین سلطان شاہ کے جاتے ہی ادھر چلا آیا۔ ملازمہ بھی اسی وقت باسٹ اٹھائے ہوئی تھی۔ امین نے خود کو میٹ پر گر کر اگر گھر اسانس کھینچا۔ اب اس کا دل گرگڑا کر خدا کے حضور سلطان شاہ کے لیے بیٹے کا طلبگار ہو گیا۔



درجنف نے آزر کو ایک ہفتے بعد بلا لیا۔ وہ مدت گھر بیٹھ کر گزارا نہیں چاہتی تھی۔ جو کچھ بھی کرنا تھا وہ بہت جلد کرنا چاہتی تھی۔ مراد احمد اس کا بہت وقت ضائع کر چکا تھا مگر ایک ہفتہ تو کیا ایک مہینہ گزر گیا آزر کو نہ آتا تھا نہ آیا جیسے جیسے وقت بہت رہتا اور درجنف کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آزر سے رابطے کے لیے فون کیا مگر وہاں سے عقدہ کھلا اس گھر میں آزر نام کا کوئی شخص رہتا ہی نہ تھا۔ اب صحیح معنوں میں درجنف کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ آزر تو اسے ابھی کینیڈا ٹیئر دے گیا تھا۔ اب جانے فون رسیو کرنے والے نے جھوٹ بولایا آزر نے اس کے ساتھ دھوکا کھا تھا، مگر آزر کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے خود کو تسلی دی تھی اور پھر سے وہی ٹیئر گھما دیا۔ آزر سے متعلق استفسار پر فون سننے والا اس سے الجھ پڑا۔

”بی بی! آپ کون سی زبان سمجھتی ہیں۔ میں بتا چکا ہوں یہاں آزر نام کا کوئی شخص نہیں رہتا آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔“ اور درجنف کو یقین آ گیا آزر کی دھوکہ دہی پر بھی اور اس بات پر بھی کہ یہ لہجہ آزر اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کتنی بھولت سے وہ اسے برادر کر کے لوٹ گیا۔ اس کی کمزوری کو جاننا اور اپنا مقصد عمل کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔ اب اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا۔ عبرت حاصل کرنا چاہیے تھی مگر وہ بھی درجنف تھی آزر کا آسرا چھوٹا تو آسیہ کے پیچھے پڑ گئی۔ کوکہ آسیہ کی شادی ہو جانے کی صورت میں یہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا مگر درجنف کوشش ترک کرنا نہیں چاہتی تھی اسے ہر صورت اپنے خوابوں کی تعبیر پانا تھی۔



چوتیس گھنٹے زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد امین نے ایک خوب صورت اور صحت مند بچی کو جنم دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نگاہوں نے سلطان شاہ کو حاشا تھا مگر نام کا م لوٹ آئیں۔ ملازمہ کرسی پر بیٹھی لوگھ رہی تھی۔ اس کی کراہوں پر ہز بڑا آگئی۔ امین کو ہوش میں دیکھ کر سرعت سے اٹھ کر اس پر جھکتے ہوئے بولی تھی۔

”کچھ چاہیے بی بی! امین ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔“

”پپ۔۔۔۔۔ پانی۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل کہا ملازمہ نے فوراً آگے بڑھ کر گلاس میں پانی نقل کر کے پیچھے کی مدد سے اس کے منہ میں پکا دیا۔

”مم میرا بچہ کہاں ہے؟“ ملازمہ کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے اس نے قہارت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”بچہ؟“ ملازمہ تو پہلے کبھی نہیں پھر مانتے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”بی بی جی! بچہ نہیں بچی ہے۔ کیا پریوں سا روپ ہے۔ سچ بہت کیوٹ ہے بالکل آپ کی طرح۔“

”کیا؟“ امین کا دل دھک سے رہ گیا۔ سلطان شاہ کا غصہ بلا چہرہ تصور میں لاتے ہی دوسرا پالٹا ہوا آگئی۔ اف اس نے شدید کرب سے آنکھیں موند لیں تھیں۔ دو شفاف قطرے پلکوں کی باڑھ بھلا ننگ کر بالوں میں جذب ہو گئے۔

منہ پر ہاتھ رکھے وہ جانے کتنی دیر تک سسکتی رہی۔ ملازمہ سر جھکائے مدامی کھڑی تھی شاید مجھے ابھی بی بی جی کو کہیں بتانا چاہیے تھا۔

”کیا سلطان شاہ آئے تھے؟“ خاصی دیر بعد خود کو سمجھا لیا کہ اس نے بڑی ہی آس سے ملازمہ کا چہرہ دھکا۔

”نہیں۔“ ملازمہ جھک کر ککات سے بچی کو اٹھا رہی تھی۔ اس کی بے قراری محسوس کیے ہمارسری سے لہجے میں بولی تو امین کو یک دم ہی غصہ آنے لگا۔

”تم نے بتایا ہو گا تو آئیں گے۔ جازنوں کرو انہیں۔“ شاید ٹوٹی آس کا سراوہ اتنی آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی جھنجھلا کر بولی تو ملازمہ کی نگاہوں میں اس کے لیے عجیب و غریب آمیز کیفیت لہڑائی۔

”نہیں بی بی جی! میں نے پہلے فوزیہ بی بی کو کہا تھا پھر صاحب کے موائل پر رنگ کر کے انہیں بھی آگاہ کیا تھا۔“ سرخ کھیل میں لپٹی بچی اس کے پیلو میں مانتے ہوئے ملازمہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

”وہاں کی گاڈ!“ اس نے جیکے پر مضطرب سی انداز میں سر جھکا۔ کیا رد عمل ہو ا ہو گا تمہارا سلطان شاہ! ہینا غصے میں ہوں گے اور مجھے کوس رہے ہوں گے کہ میری بد دعا تمہیں لگی۔ اگر میں تمہیں بتاؤں صرف تمہاری خاطر میں نے رب سے بیٹا مانا تھا تب تم کبھی مجھ پر یقین نہ کرو۔ اس نے کہنی کے بل اونچا ہو کر بچی کی من موہنی سی صورت نکلی اور نہایت ٹیشن کے باوجود بھی مسکرا دی۔ کاش سلطان شاہ تمام سمجھ سکویہ بد دعا نہیں یہ تو کسی خاص لمحے میں مانگی گئی خوب صورت دعا ہے۔ کون سول گلابی سی بچی ہر غم سے آزاد لانی بلکیس گلابوں پر سجائے گہری نیند میں تھی۔ امین نے ماتا کے جذبے سے معمور ہو کر اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔ خدا تمہارا نصیب اچھا کرے۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی تھی اور پھر جانے کس جذبے کے تحت پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔



آسیہ کو اس کے حالات جان کر شدید دھچکا لگا کتنی ہی دیر وہ گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔

”بہت غلط ہو! بہت ہی غلط کر لیا درجنف تم نے اپنے ساتھ مجھے دیکھو میں نے اس لائن کو چھوڑ کر گھر بسایا اور تم نے بسا بسایا گھر تو دیا ہے پاؤں پر خود کھاڑی ماری۔

ارے کس عزت و شہرت کی بات کرتی ہے۔ عورت کی عزت صرف گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہے۔ لوگ تو آفس اسکول اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کو نہیں بخشے اور تو فلموں سے عزت کمانا چاہتی ہے۔ افسوس ہوا تم پر تم جانتی ہو یہ فلمی دنیا کس قدر مسموم دنیا ہے۔ محض تصوراتی ہے۔ نرا گلیمرس فلم ایکٹر میں کو لوگ پبلک پر اپنی ٹی بکھتے ہیں۔ تم نے ایک غلطی کر لی ہے مگر دوسری مت کرو۔ دیکھو اگر وہ صرف غلطی تھی تو یہ فاش غلطی ہوگی۔ خاص طور پر یہ فلمی دنیا بہت سیاہ دنیا ہے۔ نرا گمانہ عاقبت نہ دنیا کہیں بھی لمان نہیں رہتی۔ کہیں بھی سکون نہیں ملتا۔ مجھ سے پوچھو نجف میں جانتی ہوں اس لیے میں نہیں جانتی میرے بعد تم وہی رزم کھاؤ۔

”مجھے آپ کی تقریر نہیں سننا آپا میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر تم میری کچھ دکر سکو۔“

”نہیں نجف! آئی ایم ساری۔ میں کچھ نہیں کر سکتی میں نے خود سے ہی نہیں خدائے بھی عہد کیا ہے کبھی ادھر نہیں بیٹوں گی پھر تمہیں کیسے غلط راستے کا پتہ بتا دوں۔“

”دور نجف کو آئیہ کے انکار پر قصہ آگیا وہ دل میں بغض لیے اٹھی تھی اونہ۔ چلی یہاں آیا مجھ سے تو بھلا میرا موازنہ اپنے آپ سے کر رہی ہیں۔ کبھی شکل دیکھی اپنی۔ اس کی سوچ بہت منفی تھی۔ ڈانس کی تربیت وہ کسل کر چکی تھی اور اب وہ خود کو ماہر رقاصہ سمجھتی اس نے خود ہی اخبار سے ایڈریس نوٹ کر کے اسٹوڈیو کے چکر کا نثر شروع کر دیے شروع میں تو چونکیدار نے اسے اندر بھی نہ گھسنے دیا مگر چونکہ رشوت ہر کسی کا منہ بند کر دیتی ہے۔ سو دور نجف نے بھی چونکیدار کی فحشی گرم کر کے اندر تک رسائی پالی تھی۔



بچی تین دن کی تھی جب خادم حسین اسے لینے آیا۔ صبح ڈسٹارج ہو چکی تھی۔ مگر تک آتے شام ہو گئی۔ فوزیہ نے بہت خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا مگر امین بھی کبھی رہی۔ بچی کا ابھی تک نام بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ اپنے بعد اپنی بیٹی کا انور ہوا اسے بالکل اچھا نہیں لگا مگر پروا کے تھی جو شکوہ کرتی۔ سلطان شاہ کب آتا جانا اسے خبر نہ ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ اس روز بھی وہ بچی کو فیڈ کروانے کے بعد کپڑے چھینچ کر وا کے فارغ ہوئی تھی جب فوزیہ اندر چلی آئی۔

”بے بی کیسی ہے؟“ بچی کو اس سے لیتے ہوئے فوزیہ نے مسکرا کر سلسلہ کلام جاری کیا۔

”سنو آئین تم نے ابھی تک اس کا کچھ نام ہی نہیں رکھا۔“ امین جواب نہ دے پائی الدتہ آنکھوں میں دھندلہ ہو رہی تھیں۔

”کچھ سوچا تو ہوگا۔“ فوزیہ نے اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا۔ جیسی آہستگی سے پوچھا تھا۔

”نہیں خیال نہیں آیا۔“ امین گہرا سانس بھر کے بولی۔

”چلو اب رکھ لو۔“

”نہیں تم رکھو اس کا نام۔“ امین نے غیر متوقع طور پر یہ ذمہ داری فوزیہ پر ڈال دی۔

”مجھے جتنا نام بہت اچھا لگتا ہے۔ سوچا تھا۔“ فوزیہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

”بہت اچھا نام ہے چلو آج سے اس کا نام حسنا ہو۔ فوزیہ کیا تم اس کی ماں نہیں ہو پھر ایسا کیوں سوچتی ہو۔ قدرت نے ہماری بیٹی کو دو ماما سے نوازا دیا ہے۔ ڈونٹ وری دیا اگر پاپا نے آپ کو نظر انداز کیا ماما ہیں نا۔“ وہ جھک کر بچی کو بیاہ کرتے ہوئے جانے کیوں تھی فوزیہ جب سی رہی تھی۔

”فوزیہ تمہیں نہیں لگتا ہماری زندگی میں کسی چیز کی بہت کمی ہے۔“ اس کا انداز بہت کھویا کھویا تھا تھا۔

”محبت۔“ فوزیہ مسکرائی۔

”نہیں عزت۔“ امین نے نفی میں سر ہلا کر کھینچ کر۔ ”اور جانتی ہو عورت محبت کے بغیر جی لیتی ہے مگر عزت کے بغیر نہیں کاش میں اتنی بہادر ہوتی کہ سلطان شاہ سے عزت کروا سکتی۔ جانتی ہو میں نے ان سے محبت کی ہے انہوں نے نہیں جواب میں دی۔ مجھے فرق نہیں پڑا اگر چہ یہ میرا حق تھا مگر عزت عزت کے بغیر مجھے جینا نہیں آ رہا۔“

”امین پلیز۔“ فوزیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا کو یا تسلی دینی چاہی مگر وہ اور بھی نکھر گئی۔ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر اس وحشت سے روئی کہ فوزیہ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔



ایک طویل سلسلہ تھا۔ آزمائش پر آزمائش کا۔ استقامت در استقامت کا جسے عبور کرتی آتی تھی۔ گزرتے ہوئے ساہا سال کے بعد ترقی کرتے کرتے آج دور نجف ایک مشہور فلم ایکٹریس کی پرسنل سیکریٹری بن پائی تھی۔ کیا یہی تھا اس کا خواب یہ تھا اس کا کیرئیر جس کی خاطر اس نے جدوجہد کی تھی۔ ڈائیکٹرول کی تئیں کیں۔ پروڈیوسروں کے گھر سے برداشت کیے اور ہر بار ہی سب سے بڑی ستار جو پہلے ہی لٹ چکی تھی بار بار لٹاتی رہی۔ کتنی بے وقوف تھی وہ کس قدر نادان تھی۔ تصنع و بناوٹ گندی نگاہیں اور چمکتے چہروں کے پیچھے گھناؤنے کردار۔ کس قدر تک گئی تھی وہ۔ جو چاہتا تھا کیا اتنا مشکل تھا کہ پانہ نہ لگی۔ اب جا کے اسے زیاں کا احساس ہوا تھا۔ اپنے ساتھ وہ کتنا بڑا کر چکی تھی، موٹی بھری ہر رسیدہ فلمی ہیروئن جن کے چہروں کی کمال بھی لٹک چکی تھی۔ وہ خوب صورت نونیز اور شاہد اب تھی۔ پھر بھی ان کی بازو درایاں کرتی۔ وہ موٹی ہیروئن جس کی وہ سیکریٹری تھی۔ جب ہستی تو ڈر لے گا لگان ہوتا۔ وہ میک اپ کرتی تو دور نجف آئینہ دکھاتی۔ یہ کیا تھا نصیب ہاں نصیب ہی ہو سکتا ہے۔ اب اسے مراد کے علاوہ ماں اور آپا کی بھی باتیں یاد آیا کرتیں جو کچھ پر مبنی تھیں اور اب اس کے تھنڈ کا پانہ نہ چھلک گیا ابھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ گئی۔



امین حسنا کو کات میں لٹا رہی تھی جب آہٹ پر پلٹ کر دیکھنے لگی۔ فوزیہ تھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”تمہیں بلار ہے ہیں۔“ اس اطلاع پر امین تھمیری فوزیہ کو دیکھنے لگی۔ آج وہ چلہ نہائی تھی۔ فوزیہ کے اصرار پر ساڑھی پہنی تھی اور میک اپ کر کے تیار بھی ہو گئی تھی۔ صرف فوزیہ کا دل رکھنے کی خاطر ورنہ دل تو بچہ کر رکھ دیا تھا۔ اب بلاوے سے اس پر حیرت کے ساتھ ساتھ انجانا سا خوف بھی مسلط ہو گیا۔ سلطان شاہ کی آخری ملاقات یاد آتی تو دل دھک دھک کرنے لگا۔ ابھی تک سلطان شاہ سے نزو اس کا سامنا ہوا تھا اور نہ ہی سلطان شاہ نے حسنا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اگرچہ اس کے سامنے کے خیال نے ہی امین پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی مگر پھر بھی بظاہر مائل رہی بہت سے قیاس کرتے ہوئے اس نے جھک کر دوبارہ حسنا کو بانہوں میں اٹھا لیا۔

”حسنا کو بائیں چھوڑ جاؤ۔“ فوزیہ نے ٹوکا۔

”کیوں۔“ امین کی صمت چینیانی پر بل پڑ گئے اسے بے حد کوار میس ہوئی تھی جیسی تنگی سے پھاڑ لکھنے کو دوڑی۔

”امین! تم تو جانتی ہو۔ پلیز غلط مت سمجھو۔ مجھے کیا فائدہ ان کا موڈ آف کرنے کا۔“ فوزیہ نے رسائی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ پھٹ پڑی تھی۔

”بس کرو فوزیہ! مت غصہ دلاؤ مجھے۔ کیا یہ اس شخص کی اولاد نہیں ہے۔ میں کیوں اسے کسی گناہ کی طرح چھپاؤں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے یہ بات میں صاف تم سے کہہ رہی ہوں بلکہ ان سے بھی کہہ دوں گی۔ اگر موڈ آف ہوتا ہے تو آئی ڈونٹ کیئر۔“ فوزیہ نے خاموش رہتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

”جیسے کہہ رہی ہوں تم نہیں سمجھو گی۔“

امین حسنا کو کاتھا لیے ہی سلطان شاہ کے روم تک آئی تھی۔ ٹاک کرنے کے بعد دھڑیر سے اندر قدم رکھ دیے۔ سلطان شاہ اسی سمت توجہ تھا۔ امین کے قدم لمحہ بھر کو ڈٹ گئے۔ حسنا کے خنہ و وجود پر اس کی گرفت لا شعوری طور پر مضبوط ہو گئی اس کی سلیکٹی نگاہوں سے نگاہیں جراتے ہوئے خود کو سنبھالتی صوفے پر جا گئی۔ دراصل وہ اپنی گھبراہٹ اس پر عیاں ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”تمہیں یاد ہو گا میں نے کہا تھا اگر تم سے میری خواہش پوری نہ ہوئی تو میں سمجھوں گا۔ مجھے تمہاری بد دعا لگ گئی اور اس کی کڑی سزا وقت پر چھوڑ دی تھی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں سزا دی جائے مگر اس سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں اب بھی میرا اٹھائے تن کر کھڑا ہوں۔ نہ میرا غور ٹوٹا ہے نہ ہی خدمتہ کے بل گری ہے۔“ اس کے سر دلچے میں رعونیت بھری تھی۔ امین اس فرعونیت کے مظاہرے پر قہر کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اٹھ کر امین کے قریب آن رکھا۔ امین دم سا دھبے بے حس و حرکت پھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”جانتی ہو میں کیا کرنے والا ہوں۔“ سلطان شاہ نے آتش کی نگاہوں سے اس کا وجود جھسم کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ امین لب بستہ رہی اس میں چلنے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ سلطان شاہ زہر خند سے ہنسا پھر جھک کر نہایت بے دردی سے حسنا کو اس کی کوسے بچھٹ لیا۔ سوئی ہوئی بچی اس اچانک افتاد پر نیند سے بیدار ہو کر بلکے لگی اور جیسے امین کا سکتہ بھی ٹوٹا تھا وہ ہڑپ کر اٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ سلطان شاہ سے کچھ بات ہی اس کی سرخراہٹ پر بھونچکی رہ گئی۔

”میں نے نا وہ نساؤ کی جو جو بڑی ہو کر میرا سر جھکاے گی یا مجھے کسی بھی طور کسی استقامت سے دوچار کرے گی۔ مجھے بیٹا چاہیے تھا تمہاری بد دعا کے اثر سے بیٹی ہوئی جو کہ مجھے نہیں چاہیے۔ میں اسے شوٹ کر دوں گا۔“ امین اس کی سفاکی پر سرتاپا لرزائی اسے لگا تھا سلطان شاہ محض دھمکی نہیں دے رہا اس کی آنکھوں میں آرتا خون اس کی دردنگی کا نماز تھا۔ امین نے جھرجھرا کر نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”نہیں نہیں سلطان شاہ! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ آپ کا خون ہے۔ آپ کی بیٹی ہے۔ پلیز اسے مجھے دے دیں م۔“ وہ بات مکمل نہ کی تھی اس کا گلہ رہا تھا بلکہ آواز سے رو تے ہوئے سلطان شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ سلطان شاہ پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ بچی امین کی کھینچے سے دور تھی اور سلطان شاہ جانے اس کا گلہ دہا رہا تھا کہ بچی بری طرح تروپ رہی تھی۔ امین کوئی چارہ نہ پا کر جیسے جنونی ہو گئی۔ سلطان شاہ کے فولادی سینے پر کئے مارتے ہوئے اسے جھنجھوڑتے ہوئے بلکے لگی تھی۔

”چھوڑ دو چھوڑ دو میری بچی کو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میرے حال پر دم کرو۔ تم انسان نہیں دوندے ہو۔“ وہ دھڑا زیں مارتے ہوئے حال سے بے حال ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان شاہ کے وجود کو جیسے خفیف سا جھٹکا لگا تھا۔ وحشت جنوں غور ایک حوالے پاتے ہی جھنجھٹا اٹھا۔ خدا کا واسطہ یہی کہا تھا امین نے۔ اس کے اندر ابلتا لاوہ جیسے ختم گیا۔ حسنا کو صوفے پر ڈال کر وہ رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ امین ٹھٹھکی تھی اور سخت خوفزدہ نگاہوں سے صوفے کی سمت دیکھا۔ حسنا تیزی سے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے دوری تھی۔ امین کے اندر دم توڑتی امید جیسے بھر سے جی اٹھی۔ دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس نے حسنا کا ہاتھ جوڑا ہاں بانہوں میں بھر لیا اور برقی آنکھوں سے اس کے زندہ ہونے کا یقین کرتی اسے چوسنے لگی جبکہ سلطان شاہ اپنے اندر چھڑنے والی جگ سے جیسے خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ سر جھٹکتے ہوئے تیزی سے واش روم میں گھس گیا۔



اماں کی صحت بہت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ دور نجف کی پامیت اور فسردگی کو دیکھتے ہوئے اب انہوں نے اسے کھلم کھلا ارام دینا چھوڑ دیا تھا۔ اب ایک دم سے

میں اپنی بات پہلے سے بہت بدل گیا ہوں
 کبھی بارشیں ہوں تو گھر سے باہر نہیں نکلتا
 چاندروں کے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیتا
 میں نے کتنی ہی ٹھٹھکی اور محبت کرنے والی لڑکیوں کے دلوں کو ٹوڑا ہے
 کہیں کوئی گیت سنائی دے
 تو لوہی آواز میں اپنے آپ سے گنگو شروع کر دیتا ہوں
 کوئی بچہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر پڑے تو اسے سہارا نہیں دیتا
 کسی نابالغ یا ضعیف کو سڑک کے کنارے محتاجی کے عالم میں
 کھڑے دیکھ کر بے اعتنائی سے گزر جاتا ہوں
 دیکھو کیسی کیسی تبدیلیاں آ گئی ہیں مجھ میں
 کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید ایسا کبھی نہ ہوتا اگر

میں اپنے دل میں تمہاری محبت کے دکھ کو زندہ رہنے دیتا
 سلطان شاہ نے سید فرحت شاہ کی کتاب بند کر کے نیکے پر ڈال دی۔ ایک طویل سرد آہ اس کے لبوں سے آزاد ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ پچھلے ایک دن اور ایک رات سے وہ کمرے میں بند جیسے خود کو بھی بھولا ہوا تھا۔ درجنف کو خادم حسین کی بیوی کے روپ میں سامنے پا کر بھی جیسے برسوں کی بھرتی آگ دم نہ ہوئی بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منتشر ہو رہے۔ بس سا ہو گیا تھا۔ لیورنگ آنکھوں میں وحشت کی سرخیاں پھیل رہی تھیں۔ اس کی اک اک اداسے اضطراب جھلک رہا تھا۔ فوزیہ اس کی پریشانی بھانپ گئی تھی اور اب حدودِ رجبے قمری محسوس کر رہی تھی مگر اندر جانے اور اسے مخاطب کرنے کی ہمت تھی نہ جرأت۔ اسے یہ بات حیران کر رہی تھی۔ سلطان شاہ نے خادم حسین کو بھی طلب نہیں کیا تھا۔ فوزیہ عیناً کو فیذ کروانے کے بعد اب اسامہ کو کھانا کھلا رہی تھی مگر اس کی بے دھیانی سے ظاہر ہو رہا تھا اس وقت تو جہ کہیں اور ہے۔ ابھی سلطان شاہ اپنے کمرے سے نکل کر پوریلو کی جانب جانا نظر آیا۔ فوزیہ با سرعت اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی تھی مگر تب تک وہ گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔ فوزیہ شغری سانس بھر کے رہ گئی۔ پلٹ کر اسامہ کے بجائے سلطان شاہ کے بیڈروم میں آئی تھی مگر اندر داخل ہوتے ہی چکر لگی کر وہ ابھی تک اندر صیر سے میں ڈوبا ہوا تھا۔ فوزیہ کو اپنا دم اٹکنا ہوا محسوس ہوا کچھ گہرا کر پڑے کھینچتے ہوئے در پہنچے کھول ڈالے۔ سورج کی چمکدار شعاعیں کمرے کے اندر صیر سے کوٹھل گئیں۔ بے فکری بستر اس کی شب بیداری کا غماز تھا۔ فوزیہ کا دل دکھ کے شدید احساس سے بوجھل ہو گیا۔ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی سلطان شاہ پر کیا قیامت ٹوٹی ہے البتہ وہ سنا تھی کی اس پر قمری اور خوروجاں گئی۔ کمرے کی حالت درست کرتے ہوئے اس کا دل اندر دنگی سے بوجھل ہوا جا رہا تھا۔



خادم حسین گاؤں آیا تھا اور رات گزار کر واپس جا رہا تھا۔ ابھی درجنف نے اسے پکارا تھا۔

”یہ لے جائیں۔“

”کیا ہے یہ کس کو خط لکھی ہے اور کیا خصم کو لے ڈالیا کچھ لیاری۔“ وہ اس پر جڑھوڑا تھا۔ درجنف نے لبوں کا کوندہ اتار توں تھے داب کر بے دردی سے کھل ڈالا۔ ”یہ خط آپ اپنے مالک کو دے دیجیے۔ میرا مطلب ہے سرکار کو۔“ درجنف نے فوری وضاحت کی اور پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ خادم حسین کا غصہ پل میں ہوا ہو اٹھا۔ خط کو جب میں ڈالتے ہوئے اس کے ذہن میں شک کا کوئی ناگ نہیں بکھلایا۔ جانے اسے اپنے مالک پر اندھا دھند بھروسہ تھا کہ بیوی سے یہ وجہ پوچھنا کو انرا نہ لگے تو یہ خط انہیں کیوں لکھ رہی ہے۔ درجنف بھی اس کے اندر سے اعتماد کو پا گئی تھی بہت ہمت کر کے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔

سلطان شاہ نے ابھی کچھ دیر قبل ہی فوزیہ کو ڈانٹ کر بھجا دیا تھا۔

”اگر دوبارہ ادھر کارخ کیا تو ناگسٹ توڑ دوں گا۔“ فوزیہ سہم کر چلی گئی تھی۔ پیپر کائن کے سرخی شلوار سوٹ میں بکھرے بالوں اور سرخ انگاروں کی مانند دیکھی آنکھیں لیے یہ اس سلطان شاہ سے قطعی متکلف نظر آ رہا تھا جس سے اس کے جاننے والے واقف تھے۔ خادم حسین کے دل پر کاری ضرب لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ دروازہ بجا کر بے آواز قدموں سے اندر چلا آیا تھا۔ سلطان شاہ جانے کہاں گم تھا کہ اس کی آمد سے آگاہ نہ ہو پا پا باب جو اس نے پکارا تو چونک کر اٹھ بیٹھا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ خادم حسین کا دل جیسے ٹھوکر کھلا کر رہ گیا۔

”سرکار گستاخی معاف، کوئی خطا ہو گئی کہ آپ نے ہاجیر کو خدمت کا موقع نہیں دیا۔“ خادم حسین ہاتھ باندھے سخت روپائسا ہو کر کہہ رہا تھا۔ سلطان شاہ نے اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ کٹر کر پھیر لیا۔ بھاری لہجے میں بولا۔

”کچھ نہیں خادم حسین! ابھی تم جاؤ۔ جب تمہاری ضرورت ہوگی بلو الوں گا۔“ خادم حسین پوری طرح خوش نہ ہو پا پا وہ جان چکا تھا اس کا مالک کسی بہت بڑی تکلیف میں ہے۔ جب سے وہ اس کے ساتھ تھا آج تک اسے اتنا ٹوٹا ہوا کھرا محسوس نہ کیا تھا۔ اس کا لب نہیں چل رہا تھا اپنے مالک کے دکھ سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتا۔ سلطان شاہ نے خادم حسین کو ٹوڑ کھڑے دیکھ کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ”آج تک ایسا نہ ہوا تھا کہ سلطان شاہ نے حکم دیا ہو اور خادم حسین ایک پل کی تاخیر کرے اس کی سرخ انگارہ ہوتی آنکھوں میں حیرانگی صاف پڑھنی جاسکتی تھی۔

”سرکار! گستاخی معاف آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر کو بلا دوں۔“ خادم حسین تذبذب کا شکار ہونے لگا۔ اپنی تفتیش ظاہر کر گیا۔ سلطان شاہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”اس کی ضرورت نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں تم جاؤ۔“

”سرکار معاف کیجیے کیا میں آپ کے پاس رکوں۔“ خادم حسین مضطرب سا بولا۔ سلطان شاہ اب کے جواب دیے بنا اس پر وہی مخصوص سرد دھکا ڈال گیا۔ کوپا جتا رہا تھا تم اپنی حد کر اس کر رہے ہو۔ خادم حسین گڑبڑا کر سر جھکا گیا۔ دروازے کی جانب جاتے ہوئے جیسے کچھ یاد کر کے خود کو گوستا ہوا پٹا تھا۔

”سرکار! معافی چاہتا ہوں یہ آپ کے لیے ہے میری گھروالی نے دیا ہے۔ کہہ رہی تھی آپ کو لازمی چنچا دیوں۔ سرکار لگتا ہے اپنی اس روز والی غلطی کی معافی مانگی ہے۔ نقصان کو بھی بہت بڑا کیا تھا اس نے۔“ خادم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے خادم حسین بتا رہا تھا۔ جبکہ سلطان شاہ تو ایک لفظ پر انگ گیا ”نقصان“ اس نے اذیت سے آنکھیں پٹی سے بند کر لیں مگر خادم حسین کی آواز کا کیا کرنا جو صور اسرافیل کی طرح کانوں کے پردے چھاڑے مانتوں میں گھسی چلی آ رہی تھی۔

”ویسے سرکار! میں نے بہت ٹھکانے کی اس کی۔ محسوس کو مانی یاد آگئی ہوگی۔“ سلطان شاہ کا چہرہ اس انکشاف پر تاریک ہوا تھا۔ فوراً رخ موڑتے ہوئے اس نے چہرے پر اندر تے تاڑ کو خادم حسین کی زیرک نگاہوں سے محفوظ کیا تھا۔ پتلا دانتوں تلے اس شدت سے دبایا کہ خون کا ڈانڈہ منہ میں محسوس ہونے لگا۔

”سرکار! اگر آپ نہیں پڑھنا چاہتے تو میں آگ میں جھونک دوں گا۔“ اس کے یوں رخ پھیرنے پر خادم حسین نے جو محسوس کیا اس کے مطابق کو یا اسے خوش کرنے کی خواہش کی۔

”اے رکھو خادم حسین اور تم جاؤ۔“ سلطان شاہ نے بوجھل لہجے میں کہا تب خادم حسین نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر حکم کی تعمیل کی تھی۔

سلطان شاہ مضطرب نہ کمرے میں پکرا رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں گاہے گاہے ٹہیل پر رکھے اس مفید لفافے سے اٹھ رہی تھیں۔ خادم حسین صبح سے یہ خط دے گیا تھا اور اب شام ڈھل آئی تھی۔ تب سے سلطان شاہ نہ باہر نکلا اور نہ کسی کو اندر آنے کی اجازت ملی۔ مسلسل ٹھٹھکی کے باعث ناگسٹ ٹھیل ہو رہی تھیں۔ خطر پہنچا ہوا ڈالتے ہی وہ جیسے اندر سے کھل جاتا۔ برسوں سے چھایا جو ڈھونڈ لگتا۔ دل مضطرب ہو کر جہان کی طرح سخت سلطان شاہ کو بکھلانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔

”کھولو پڑھو دیکھو جیسی کیا لکھا ہے۔ اس پس محسوس کرو جیسے تم نے زندگی جانا۔“ اور سلطان شاہ خود سے تو خائف ہو گیا تھا۔ اسے اپنا لمبا چوڑا مضبوط سراپا اس وقت ایک ختمے سے بچے کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ جو بے حد خوفزدہ تھا۔ سخت سہا ہوا جانے اس بند لفافے کو کھولنے سے کیا کیا انکشاف ہوتے۔ شاید وہ منجبال نہ پانے خود کو ڈھسے جائے۔ پھر وہ کیا کرے گا۔ صبح سے یہی جنگ چھڑی تھی اندر بھی سلطان شاہ نے ٹھٹھکی ٹھٹھکی لڑ میں خود کو صوفیے پر گر ادیا اور جیسے کسی منطقی نتیجے پر پہنچ کر خط اٹھا لیا لفافہ چاک کرتے ہوئے ان مضبوط ہاتھوں میں واضح لٹریچر لڑائی تھی پر چھل چکا تھا۔ سلطان شاہ کی بے تاب نگاہیں سطروں پر پھیلنے لگیں۔

کل شب میں میں نے گلی میں موت کو دیکھا
 وہ بالکل اس زندگی میں جیسی تھی
 جیسی زندگی میں تمہارے بغیر جی رہا ہوں
 السلام علیکم!

خدا سے دعا ہے آپ کو زمانے کی تمام خوشیاں نصیب ہوں (آمین)۔

مراد احمد یا سلطان شاہ سوچتی ہوں زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے کہ آپ کو مخاطب کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی ہوں۔ میری زندگی میں آپ مراد احمد بن کر داخل ہوئے اور کوپا بھادوں نے میرے گھر پر ڈیر ڈال لی مگر میری بد نصیبی خیر چھوڑتی ہوں یہاں ذکر میرا نہیں آپ کا ہوگا۔ آپ چونکہ خادم حسین کے مالک ہیں اور وہ آپ کو بہت چاہا اور احترام سے سہارا دیتا ہے۔ کیا میں بھی لیکن نہیں میں تو اس قابل بھی نہیں کہ آپ کو مخاطب کر سکوں۔ سلطان شاہ شاید آپ یہ خط پڑھے بغیر ہی چھاڑ دیں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خادم حسین سے وصولی نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے میرے خدشات غلط ثابت ہوں اور آپ یہ خط پڑھیں تو میں مگر میری التجا پوری نہ کریں سب کچھ ممکن ہے اور آپ کو حق بھی ہے اپنی مرضی کرنے کا۔ خادم حسین آپ سے بہت محبت کرتا ہے اور بہت متاثر بھی ہے آپ کی شخصیت سے شاید ہر محبت اپنے محبوب کو اسی طرح فالو کرتا ہوگا۔ جس طرح آپ کو خادم حسین ہاں سلطان شاہ وہ آپ کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ ان چند دنوں میں اس نے مجھ سے جواب بھی کی اس میں آپ کا ذکر شامل تھا اور آپ کی زندگی کو میں اسی قدر جانے لگی جس قدر وہ جانتا ہے۔ دکھ اس بات کا ہے سلطان شاہ آپ تو ایک آئینہ بل مرد تھے۔ یہ کون سی روش اپنائی۔ کیوں خود کو پر باد کر ڈالا۔ موت سے کھیلنے میں صرف پیسے کی خاطر۔ اور آہ سلطان شاہ وہ گرہیں جو کسی پہ نہیں کھل سکیں انہیں میں نے ہی باندھا۔ مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ آپ پہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ آپ نے میری سوچ سے بڑھ کر توقع سے کہیں زیادہ دولت جمع کر لی ہے مگر سکون کیوں گواہی اور میں جانتی ہوں یہاں بھی ذمہ دار میں ہوں۔ سلطان شاہ جانے آپ نے زندگی میں کبھی مجھ سے سامنا ہوا جانے اور مجھ جتانے کی خواہش میں یہ سب کیا ہے یا نہیں لیکن تقدیر نے جہاں اور بہت سے مقام پر مجھے میری غلطی اور زیادتی کا احساس دلایا۔ وہاں آپ کے در پر بھی لے آئی لیکن مجھے لگا جیسے یہاں ابے مقصد نہیں تھا۔

قدرت کے اس کام میں مصلحت پوشیدہ ہے، جیسی میں آج آپ سے مخاطب ہونے کی جرأت کر رہی ہوں۔ آپ کو یاد ہے اس روز آپ نے خادم حسین سے کہا تھا ہے جان چیزیں انسانی احساسات سے زیادہ قیمتی نہیں ہوا کرتیں جو چیز دولت سے حاصل ہو جائے چاہے وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اسے کبھی بھی انسانی فیلنگ پر فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ جانے میں خوش فہمی کے ثبوت میں ذہن ہو کر ایسا سوچتی ہوں کہ آپ کو خادم حسین کے بہرے ساتھ روایہ کے سلوک نے ہرٹ کیا تھا۔ جیسی آپ نے ایسا کیا جو نہ جیسے خادم حسین نے آپ کو شکوہ کیا ہے اس کے مطابق اب آپ کے پاس ایسے احساسات کا گزر بھی نہیں کہنے کا مقصد یہ ہے آپ میرا انتقام دوسری عورتوں سے بلکہ ہر عورت سے کیوں لے رہے ہیں۔ آپ نے روشادیاں کر لی ہیں اور ان کے ساتھ آپ کا رویہ بے حد غیر مناسب ہے۔ ایک گئی بات بتاؤں آپ کو سلطان شاہ ہماری سرزمین کی خوش نصیبی یا اللہ کا کرم سمجھ لیں کہ یہاں نانوائے فیعد عورتیں باجیا اور وفا جہیں۔ سو میں سے ایک عورت تھجھجی بے وفا ذلیل ہوتی ہے جو معاشرے میں کسی غلیظ گالی کی مانند بن کر رہ جاتی ہے۔ مقتدر کی سیاسی بن کر آپ جیسے باکردار مرد کی مسیح پیتا بی پرکا تک بن کر چپک جاتی ہے اور آپ کی بد نصیبی آپ کے حصے میں وہی عورت آتی۔ اس ایک عورت کو معاف نہ کریں سلطان شاہ لیکن باقی کی معصوم عورتوں کو بھی جبر اس کیپیگری میں شامل نہ کریں۔ سلطان شاہ سوچئے غور کریں کیا آپ کے تمام مظالم اور رونا کھجی جانے والی کج ادائیگوں کے باوجود وہ دونوں عورتیں آپ سے محبت نہیں کرتیں۔ جنہیں اب آپ کی دیویاں ہونے کا اعزاز مل چکا ہے۔ آپ کے ساتھ وہ فانی بن جا رہی ہیں۔ کیا انہوں نے آپ کے بچوں کو ختم نہیں دیا۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ نے انہیں درجنف کی جگہ کیوں رکھ دیا۔ آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھ جاتے کہ آپ کی زندگی میں آنے والا ہر ساتھی بے وفا نہیں ہے۔ بس اک جتن ہی ہر جانی تھا جو اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ جانتے ہیں سلطان شاہ کل خادم حسین مجھے بہت تنگ میں بتا رہا تھا کہ اس کے سرکار چھوٹی بی بی کے بعد ایک اور شادی بھی کریں گے۔ صرف چھوٹی بی بی کو بچا دکھانے کی خاطر اور جو سرکار سے گستاخی کرتا ہے وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ دیکھا آپ نے سلطان شاہ اپنی محبت کے رویوں کا حال ان کی اپنی سوچ سمجھ ہی نہیں رہی۔ کبھی آپ اپنی آنکھوں سے نفرت کی چادر ہٹا کر فوزیہ بی بی اور امین بی بی کو دیکھئے پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ چھوٹا اور چھوٹا کار کی اور روشنی کا فرق مان لیں۔ وہ درجنف نہیں ہیں۔ وفا کی دیویاں ہیں۔ چھوٹوں سے بھرے دل رکھنے والی۔ سلطان شاہ آپ سے گزارش ہے اگر آپ کے دل میں اب درجنف کے لیے ذرا بھری محبت ہے تو اس محبت کا واسطہ دے کر التجا کرتی ہوں تمام برائیوں کو چھوڑ دیجئے۔ فوزیہ امین کی جانب لوٹ جائیے۔ آپ کا کھوپا ہوا سکون مل جائے گا۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے۔ خدا ضرور معاف کرے گا کہ آپ نے درجنف کی طرح بڑے بڑے گناہ تو نہیں کیے۔ اس کے باوجود مجھے رب سے مایوسی نہیں وہ ضرور معاف کرے گا۔ یہ میرا دل کو ای دے رہا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں اب میں آپ پر کوئی حق نہیں رکھتی نہ ہی مجھے آپ سے کہنا چاہیے مگر سلطان شاہ درجنف نے ساری زندگی صرف گناہ کیے ہیں۔ ایک نیکی کما چاہتی ہے اگر ہو سکے تو اس کی مدد کیجئے۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے میری وجہ سے ہی یہ آپ سیٹ ہوا ہے۔ اور اب میں اپنا بویا کاٹ رہی ہوں۔ جب سے جب سے آپ سے جدا ہوئی آپ کی بہتری کی خواہش مند۔

بد نصیب درجنف

خدا قسم ہو چکا تھا۔ سلطان شاہ نے کاغذ مٹی میں بھیج کر یوں سے چھوڑا آنکھوں سے بہتا سیال پھرے کو بھگو چکا تھا۔ ہاں وہ سلطان شاہ رو رہا تھا جو تب بھی نہیں رو رہا تھا جب اس نے درجنف کو خود سے الگ کیا تھا اور نہ جب درجنف نے اس کی اولاد کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ یہ دکھ تو اس کے اپنے دکھ تھے۔ اور وہ کمزور تھا نہ بڑا دل مرد تھا۔ پھر کیسے رو لیتا جیسی دل پر آنسو گر کر آنکھوں کو خشک چھوڑ دیا لیکن اب وہ مضبوط نہ کر سکا تھا نہ ہی برداشت کیونکہ یہ دکھ درجنف کا تھا۔ وہ اپنے لیے کب رو رہا تھا۔



درجنف کو طاق دینے کے بعد مراد گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہاں جانا ہے۔ نہ منزل کا پتہ تھا نہ راستوں کا علم۔ شاید جب محبت روکتی ہے تو ہر شے ہی آنکھیں پھیر لیا کرتی ہے۔ دل زندگی سے ایک دم ہی اچاٹ ہوا تھا۔ بے پناہ شاکہ ہوا تھا کہ بھلا کیا بگاڑا تھا میں نے کسی کا جو میرے ساتھ ایسا ہوا۔ اس وقت وہ اس بچے کی طرح رٹھ رہا ہوا تھا جس سے اس کا سب سے پسندیدہ کھلونا چھین گیا ہوا۔ اتنے بڑے دکھ پر اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہائے مگر یہ ستم ہی تو تھا اتنی بڑی دنیا میں سب پرائے تھے۔ بعض اوقات غم کی شدت میں بھی آنکھیں خشک رہتی ہیں۔ دل پر آنسو گرتے رہتے ہیں اور اسے ناکارہ کر جاتے ہیں مراد احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ وہ بہت ساروں چاہتا تھا مگر وہ نہ پایا اور یہ بوجھ جسے دل پر بٹھیر گیا تھا۔ عجب بے رونق اور سنا آتا تھا۔ ہر سو یہ راستے اس کے لیے اجنبی تو نہ تھے مگر کسی قدر بے گامگی سے اسے تک رہے تھے۔ سنگین وجود کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہوئیں تب وہ واپس قریبی پارک کی جانب آ گیا۔ دن کب گزر رات آئی اسے خبر نہ ہوئی۔ اس کی زندگی کی طرح اب ہر شے تاریک اور میراں تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ رات کا جانے کون سا پھر تھا جب پولیس کی گشتی پارٹی نے اسے دھر لیا۔ مختلف سوال ہوئے تھے۔ جن کا جواب وہ ضرور دیتا اگر دماغ حاضر ہوتا مگر کمر سپاہیوں کی شکلیں دیکھتا رہا۔ کانٹیل نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر سب کچھ تھیلانے کے بعد موبائل میں بٹھایا اور لا کر حوالت میں بند کر دیا۔ وہ تب بھی گم سم رہا تھا۔ تین دن بے یار و مددگار حوالت میں بند رہا۔ کون تھا جو اسے چھڑانے آتا۔ پولیس بھی جانے بھول گئی پھر وہیں حوالت میں کمال عرف کو نے زبردستی اس سے روٹی گانٹنے کی کوشش کی۔ مگر مراد نے یہاں بھی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ کمال عرف کو حوالت سے نکالا تو ساتھ ہی مراد کی بھی ضمانت کروادی۔ پولیس کے ساتھ کو کے اچھے تعلقات تھے یہ تو بس دینا دکھاوے کو کو کوٹیل میں بند کیا گیا تھا پھر کو نے مراد کی جان نہیں چھوڑی۔ وہ جوئے کا اڑا چلا تھا اور مراد میں اسے جانے کیا نظر آیا کہ اسے اپنے ساتھ کام میں شریک کرنے پر مہم ہو گیا۔ مراد چونکہ فطرتاً نیک اور شریف تھا سو صاف انکار کر دیا۔ وہ اس خالی اور ویران گھر میں لوٹ آیا مگر کہہ نہ ہونے کے باعث جلد ہی اس مکان کو خالی کرنا پڑا۔ جاب سے بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی جگہ بنا بندہ رکھ لیا گیا تھا۔ اب وہ صحیح معنوں میں لاوارث ہوا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا درجنف کی بخشی ہوئی فقر توں کے حصار میں وہ دل گرفتہ سا بچھا تھا کہ کو نے آکر چڑکا دیا۔ مراد نے ناکواری کا اظہار کرنا چاہا تو کو خباثت سے ہنس دیا۔

”ہمیں انکار کرنے سے پہلے پیار سے اپنے پیاروں کو سوچ لو۔ تمہیں ہر صورت میرے ساتھ شامل ہونا ہے ورنہ میں تمہاری فیملی کو رات کے وقت۔۔۔“ مراد چونک گیا۔

”کون میری فیملی۔ میرا کوئی نہیں ہے میں تنہا ہوں۔“ اس کے انکار پر کو بٹھا تھا اور کتنی دیر تک ہنستا رہا۔

”پیار سے نہیں نہیں، بھلاؤ کیا تمہاری ماں نہیں ہے۔ دو بھائی اور تین بہنیں نہیں ہیں۔ ہم جیسے لوگ جس پر ایک نظر ڈال لیں اس کی کمزوریوں کو سب سے پہلے قابو کرتے ہیں۔ بول اب کام کرے گا پھر تیری بہنوں کو لے آئیں ایک رات کے لیے اپنے اڑے پر۔“ مراد جو بے لب سمجھے ہوئے تھا مزید برداشت نہ کر سکا اس کا غیرت مند خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ ایک لمحہ لگا تھا اور اگلے ہی لمب وہ کو کی دھناتی میں مصروف تھا۔ کو نے چپ چاپ اس کے گھونے کو پیچھا لیا۔ جب وہ اپنے گاہک اسے شانوں سے تمام کر دیا وہ بٹھاتے ہوئے ہونٹوں سے اپنا خون صاف کرتا ہوا بولا۔

”بہی چیز بہت اچھی لگی نہیں تمہاری۔ صرف خوب صورت نہیں ہو۔ شریک مانند طاقتور بھی ہو۔ یہ بات طے ہے تمہیں آتا ہی ہے۔ ایک رات ہے تمہارے پاس فیصلہ کرو۔ اگر ہمارے حق میں ہو تو اس پرے پر پہنچ جانا ورنہ کل رات وہی ہو گا جس سے تمہیں اشتعال چڑھا ہے۔“ وہ ایک چٹ اس کے سامنے پھینک کر مڑا اور گردن موڑ کر اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”یہ بات ذہن میں رکھنا تمہارے انکار کی صورت میں پہلے تمہیں حوالت میں واپس بھجواؤں گا پھر اپنا کام کروں گا۔ ظاہر ہے مجھے نہیں اپنے دانت تھوڑی تروانے ہیں۔“ وہ کروہ پٹی ہنسا چلا گیا۔ مراد بدم سے انداز میں ہیلہ پر گر تھا اگرچہ اس کے سوتیلے رشتوں نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔ چاہتا تو وہ بھی خود کو لا لعلق بنا کر بے نیاز ہو جاتا۔ مگر وہ تو بے غیرت تھا اور نہ ہی بے حس۔ پھر جیسے فیصلہ کرنا مشکل نہ رہا تھا اور وہ رات کا انتظار کیے بنا چٹا اٹھا کر اسی وقت چل پڑا۔ پھر وہ اس دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ اسے درجنف کے آخری الفاظ یاد آتے تو جیسے دولت جمع کرنے کا جنون سر پر سوار ہو جاتا۔ شاید اگر دولت اس کے پاس ہوتی تو آج وہ نہ تنہا ہوتا اور نہ ہی دیکھی۔ وہ دولت حاصل کرنے کی خاطر ہر جائز و ناجائز راستے پر چلنے لگا جو بھی اس کے مقابل آ جاتا۔ جیت نہ سکتا۔ اس کا نام جیت کی ضمانت بن گیا۔ لڑکیاں اس کی چار رنگ پر سنائی پر دیوانہ وار لڑا رہیں تو وہ انہیں محبت کا چمکہ دیتا۔ جب وہ اس کی خاطر پاگل ہوئے لگتے تو چھوڑ دتا۔ اس طرح جانے وہ درجنف کا بدلہ چکار ہاتھ پاں یہ ضرور تھا کہ درجنف کے بعد وہ کسی عورت کے بھی اس قدر نزدیک نہ گیا تھا۔ اسے اس گناہ سے نفرت تھی جس گناہ میں مبتلا اس نے آزر زور درجنف کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے اپنا نام بدل لیا تو مراد جیسے کہیں کھو کر رہ گیا۔ ایک اشقی کو اس نے اس حد تک کنگال کیا کہ وہ اپنا سب کچھ خالی ہو گیا تب اپنی بی بی اس کے سپرد کردی۔ سلطان شاہ لڑکی کو پیسے کے بدلے رکھنا نہیں چاہتا تھا جیسی بڑھ سے بڑے لگا۔ جب وہ لڑکی ان کے درمیان آ گئی۔

”دیکھئے آپ مجھے شریف انسان لگتے ہیں۔ بابائے مجھے آج آپ کے حوالے کیا ہے تو کل کسی اور کو دے دے گا۔ پلیز آپ مجھے رکھ لیں۔ میں آپ کے گھر ملازمہ بن کر رہ لوں گی۔“ سلطان شاہ پھر بھی آمادہ نہ ہوا تو بڑا حیا بی بی کو چھوڑ کر خود چلا گیا۔ اب سلطان شاہ اس کے باپ کی طرح بے غیرت نہ تھا کہ وہ بھی اسے گھر سے نکال دیتا۔ انہی دنوں خادم حسین نوکری کے سلسلے میں اس سے ملا تھا اور اس کا ہو کر رہ گیا۔ سلطان شاہ نے اس لڑکی فوزیہ سے نکاح کر لیا۔ فوزیہ اس کی احسان مند تھی اگرچہ وہ اسے باندی بنا کر رکھتا تھا۔ فوزیہ اس میں بھی خوش تھی۔ چادر دیواری میں عزت تو محفوظ تھی۔ فوزیہ اس کی زندگی میں مزید کامیابیوں کی ضمانت بن کر داخل ہوئی تھی۔ ہر گزرتے دن نے سلطان شاہ کے لیے خوش قسمتی اور دولت کے دروازے کھولنا شروع کر دیے۔ سلطان شاہ اب چھوٹے ہاتھ مارا پسند نہیں کرتا تھا بڑے بڑے مٹھوں کو لونا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اپنا بزنس اسٹارٹ کر لیا تو جیسے دن دوگی اور رات چوٹی ترقی کرنا آسمان کو چھوئے لگا۔ اب اس کے پاس اس قدر دولت تھی کہ اسے خود بھی انداز نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ تو وہ نہ نوٹن نہ ہو رہا تھا نہ فحش من رہی تھی۔ گزرتے وقت نے درجنف کی یادوں پر فراموشی کی برف گرا دی مگر وہ لاشعوری طور پر ہر عورت کو درجنف کے روپ میں دیکھتا تھا اور اسے عورت عورت کی بجائے ناگ نظر آتی۔ نہر ملی ناگن جو موقع ملے ہی ڈنسنے سے باز نہیں آتی جیسی سلطان شاہ الٹ رہا کرتا جہاں اسے عورت نظر آتی وہی اسے ڈنسنے کا موقع دے دیتی تھی اس کا بچپن کھل ڈالتا۔ سچہ داور کے برے دن شروع ہو چکے تھے۔ کاروبار میں تیزی ان سے برداشت نہ ہوتی تو سلطان شاہ کو بزنس پائزریک حیثیت سے کاروبار میں شامل کر لیا۔ سلطان شاہ عادت سے مجبور تھا۔ انہیں بھی جوئے کی مٹھلوں میں شامل کر لیا۔ اور تب ہی ایک روز اچانک امین سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کا غرور و نخوت اور طغیان سلطان شاہ سے برداشت نہ ہوا تو نیچا دکھانے کو خصوصی پلاننگ کے بعد اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا اور اسے نیچا دکھا بھی اس کے بعد اسے قرار آ جانا چاہیے تھا مگر امین وہ واحد لڑکی تھی جس نے درجنف کے بعد سلطان شاہ کو بے بسی کیا اور اپنی شکست سلطان شاہ سے کوارا نہ تھی جیسی مگر امین تیز کر ڈالیں۔ اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بار بار بویا بار گیا ہو۔ جی بات سلطان شاہ کو زوج کرتی تھی۔ یہ اس کی انسلٹ تھی وہ نیچا دکھانا جانتا تھا خود جھکنا پسند نہیں تھا درجنف کی گزارش پر اس نے غور کیا تھا تو حقیقت پوری چٹائیوں سمیت روشن ہو گئی۔ فوزیہ اور امین اس کی کسی نیکی کا ہی صلہ تھیں۔ وہ ان سے غافل نہ رہا تھا۔ ایک ایک حرکت سے واقف تھا۔ ان میں ان کے کردار میں کبھی جھول نہ تھا واقعی درجنف نے کچھ کیا تھا۔ اس کی قسمت میں بس اک جتن ہر جانی تھا اور وہ درجنف بھی۔

